www.struggle.pk

دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ!

مسلسل اشاعت کے 42 سال

طبقاتی جدوجہد

انقلابی سوشلزم کا علمبردار!

شمارہ نومبر 2024ء

بالشویک انقلاب 1917ء

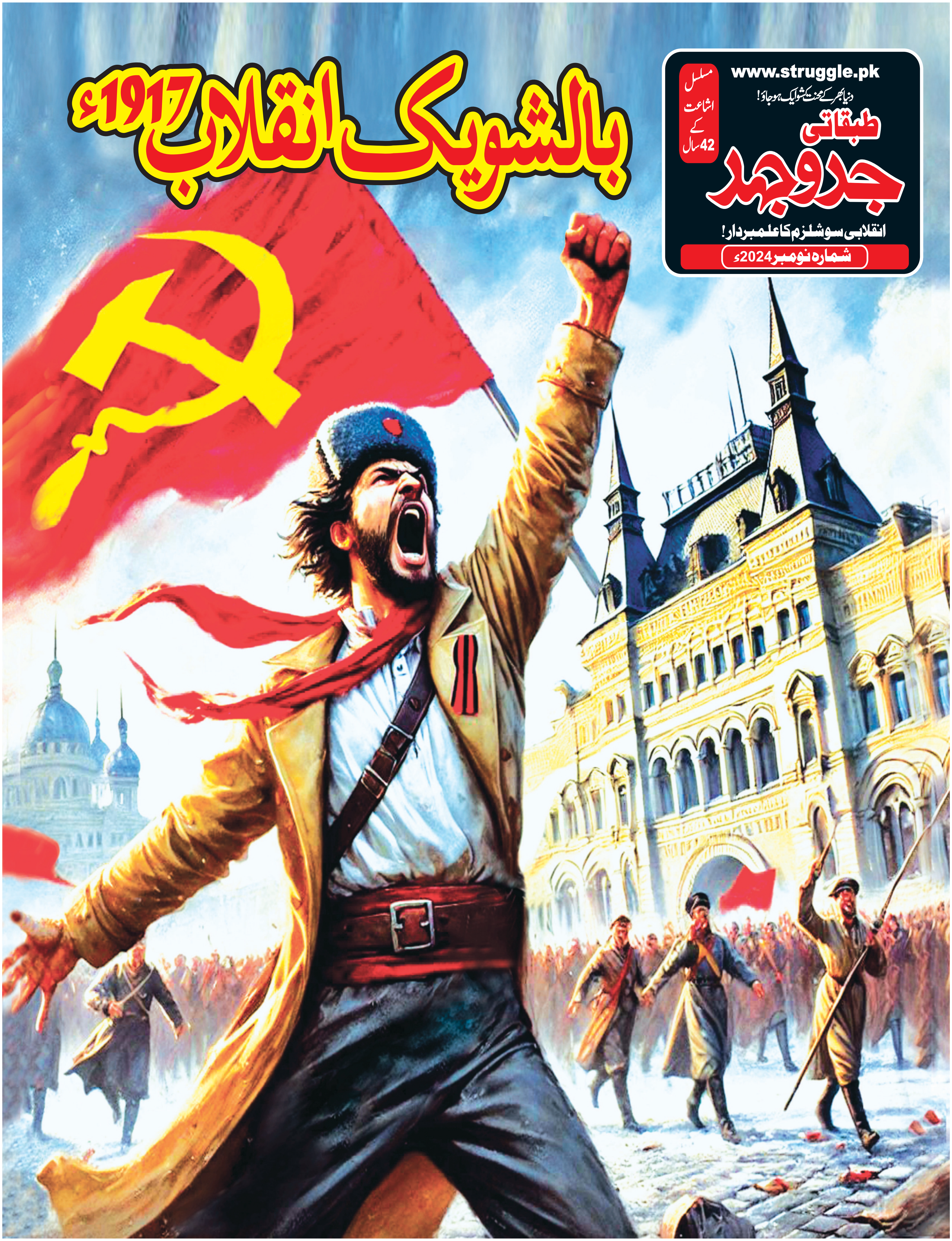

THE STRUGGLE

ایڈیٹر رنگ الہٰی

قیمت: 100 روپے
یکجہتی قیمت: 500 روپے
سالانہ سکریپشن: 2000 روپے

ادارہ جدوجہد

بنگلہ دیش کی طلبہ تحریک:

مرکزی دفتر 105 منگل مینشن سیکنڈ فلور رائل پارک لکشمی چوک لاہور
فون: 042-36316214 فیکس نمبر: 042-36365659 ای میل: strugglepakistan@gmail.com

کوئٹہ	طبقاتی جدوجہد آفس، گورودت سنگھ روڈ نزد گورنمنٹ سپیشل سکول کوئٹہ	0343-0400318
مستونگ	عبدالرحمٰن	0333-7793396
کراچی	حاتم خان لُنڈ	0337-6298801
حیدرآباد	PTUDC آفس نزد دہلی شیرمال ہاؤس، سول ہسپتال روڈ حیدرآباد	0311-3170038
میرپورخاص	پرشوتم، طبقاتی جدوجہد آفس نزد پرانا سول ہسپتال میرپور خاص	0333-3586031
ٹنڈوالھیار	محمد حسین، P.O خواجہ ویلیج ڈسٹرک ٹنڈوالہیار	0333-2884809
دادو	انور پنہور، سٹیشن روڈ بھان سید آباد	03003272023
عمرکوٹ	آزاد جھامن داس	0349-3566688
خیرپور	شرجیل شر، پوسٹ آفس ٹھری میرواہ، خیرپور میرس	03013544615
صادق آباد	قمرالزماں خاں 204/6C الحیات سٹریٹ غفور آباد	0308-7172677
رحیم یارخان	حیدر چغتائی 45-بانو بازار	0345-4761547
ملتان	ایڈوکیٹ ندیم پاشا، ضلع کچہری، ملتان	0333-6156680
راجن پور	ایڈوکیٹ عبدالرؤف لُنڈ، تحصیل کورٹس جام پور، ضلع راجن پور	0333-6186870
کوٹ ادو	مزدور کلب بمقابل GPO اقبال پارک	0300-2241860
ترنڈہ	آفس طبقاتی جدوجہد، لائبریری چوک، ترنڈہ سوائے خان	0345-8021007
ڈسکہ	ایاز ٹیپو ایڈوکیٹ، نیو جوڈیشل کمپلیکس ڈسکہ	0343-6000482
فیصل آباد	ایڈوکیٹ ادیبہ علی	0308-4931937
قصور	فیاض	0322-8753484
راولپنڈی	آفس نمبر 16-A، تھرڈ فلور، تاج محل پلازہ، 6th روڈ، راولپنڈی	0333-5358516
فتح جنگ	عبدالخالق	0315-0599951
ھجیرہ	طبقاتی جدوجہد آفس، کالج چوک ہجیرہ	0342-5548850
مظفرآباد	طبقاتی جدوجہد آفس، لوئر پلیٹ نزد سنوکر پیلس	0345-9568584
راولاکوٹ	مرکزی سیکریٹریٹ سیکنڈ فلور گلف شاپنگ کمپلیکس	0333-5698841,03459568584
کوٹلی	یاسر پینٹ سٹور ہولاڑ پوسٹ آفس تحصیل سہنسہ ضلع کوٹلی	0345-3974154
باغ	محمد ایاز خان، ایم ڈی ایس روڈ	0345-5533174
مالاکنڈ	ایڈوکیٹ غفران احد، ڈسٹرکٹ بار بٹ خیلہ	0344-9897418
بنوں	ساجد ایوب: آفس طبقاتی جدوجہد جنوبی پشتونخواہ ایل جی 30 یونیورسٹی پلازہ بنوں سٹی	03359067135
سوات	صاحبزادہ باچا، کالج کالونی سیدو شریف	0343-9618902

یورپ میں رابطے کے لئے

BELGIUM
Rana Sikander
Prekers Straat
8/1 2000
Antwerpen 1
Belgium
Ph:0032-497069406

NETHERLANDS
Asif Alvi
Admiraal De Ruyter Weg-83
III 1057JZ
Amsterdam
Ph:0031-614454298

BRITAIN
Naeem Khan
213 Billet
Road London
E17 5NS
Britain

امریکہ: زوال پذیر سامراج کے انتشار بھرے انتخابات

گلوبلائزیشن کے اس عہد میں کسی ایک ملک میں ہونے والی سیاسی وسماجی تبدیلیاں ناگزیر طور پر دوسرے خطوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ چاہے وہ ملک بظاہر معمولی معاشی وجغرافیائی اہمیت کا حامل ہی کیوں نہ ہو۔ اس حوالے سے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ پوری دنیا کی نظریں گزشتہ کئی مہینوں سے 5 نومبر کو ہونے والے امریکی صدارتی انتخابات پر کیوں ٹکی ہوئی ہیں۔ تاریخ کی سب سے بڑی معاشی وعسکری قوت ہونے کے ناتے امریکہ کی داخلی سیاست گزشتہ تقریباً آٹھ دہائیوں سے عالمگیر اہمیت کی حامل رہی ہے۔ لیکن حالیہ عرصے میں' بالخصوص 2008ء کے بعد سے عمومی معاشی بحران، عالمی سطح پر طاقتوں کے توازن کی بدلتی کیفیت (چین کے مقابلے میں امریکہ کی نسبتی زوال پذیری) اور خود امریکی معاشرت اور سیاست کے بڑھتے ہوئے انتشار نے صدارت کی اس دوڑ کو زیادہ متنازعہ اور پُر پیچ بنا دیا ہے۔

تاریخی طور پر دیکھا جائے تو امریکی حکمران طبقے کی قوت اور اعتماد کا اظہار' ملکی سیاست اور ریاست پر اس کے گہرے تسلط (Hegemony) میں ہوتا ہے۔ جس کے پیچھے ظاہر ہے امریکہ کی بے نظیر معاشی ترقی، گہری اور وسیع صنعتی بنیادیں، تکنیکی جدت، ہولناک عسکری قوت اور عالمی سامراجی غلبے جیسے عوامل کارفرما رہے ہیں۔ ان حالات میں امریکی حکمران طبقہ 'ٹو پارٹی سسٹم' کو اپنے سیاسی اقتدار کے کلیدی اوزار کے طور پر استعمال کرتا آیا ہے۔ امریکہ کی تقریباً تمام سیاسی تاریخ دو حاوی پارٹیوں کی مقابلہ بازی پر ہی مشتمل رہی ہے۔ تاہم یہ 'ٹو پارٹی سسٹم' اپنی موجودہ شکل میں 1850ء کی دہائی کے بعد تشکیل پایا۔ جس میں ریپبلکن اور ڈیموکریٹک پارٹیاں دو بنیادی اور حاوی سیاسی رجحانات کے طور پر موجود رہی ہیں۔ بورژوا دانش اور صحافت میں بالعموم ریپبلکن پارٹی کو 'دائیں' جبکہ ڈیموکریٹک پارٹی کو 'بائیں' بازو میں شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بہت جعلی اور سطحی قسم کی تقسیم ہے۔ امریکہ کی مروجہ سیاست کی اساس درحقیقت وہی ہے جسے بائیں بازو کا رجحان رکھنے والے نامور امریکی صحافی و دانشور گور ویڈال نے تقریباً پانچ دہائیاں قبل واضح کیا تھا: ''امریکہ میں صرف ایک پارٹی ہے۔ دولت اور ملکیت رکھنے والوں کی پارٹی۔ جس کے دو دائیں بازو ہیں: ریپبلکن اور ڈیموکریٹ۔ آزاد منڈی کی سرمایہ داری کے بارے میں ریپبلکن تھوڑے زیادہ احمق، زیادہ سخت گیر اور زیادہ عقیدہ پرست ہیں۔ ان کے مقابلے میں ڈیموکریٹس نسبتاً دلکش، پرکشش اور تھوڑے سے زیادہ بدعنوان ہیں... اور جب غریب، سیاہ فام اور سامراج مخالف عوام قابو سے باہر ہونے لگتے ہیں تو ان کے ساتھ لین دین یا مصالحت (Adjustments) پر بھی زیادہ آمادہ ہوتے ہیں۔ باقی ان دو پارٹیوں کے درمیان کوئی بنیادی فرق موجود نہیں ہے۔''

اگر غور کریں تو نہ صرف امریکہ بلکہ مغرب کی بیشتر سرمایہ دارانہ دنیا میں دوسری عالمی جنگ کے بعد ایسا ہی 'ٹو پارٹی سسٹم' موجود رہا ہے۔ جس میں غیر معمولی حالات یا استثنائی صورتوں سے ہٹ کے 'آؤٹ سائیڈرز' کی گنجائش بہت محدود رہی ہے۔ یہ بنیادی طور پر سرمایہ داری کو 1929ء کے بحران سے ہولناک بربادی اور خونریزیوں کی قیمت پر نکالنے والی جنگ کے بعد کے بڑے منافعوں اور بیش بہا معاشی ترقی کے حالات کا مظہر تھا۔ جس میں سماج کو دائیں اور بائیں بازو کی روایتی پالیسیوں سے چلانے کی گنجائش موجود تھی۔ ایسے میں مروجہ لبرل آرڈر کا نظریاتی تسلط آج کی نسبت کہیں زیادہ گہرا تھا اور سامراجی حکمران طبقات کے پاس اپنے چنیدہ سیاسی نمائندوں کو دہائیوں کی تربیت سے گھاگ اور زیرک بنا کے سامنے لانے اور سیاست پر مسلط کرنے کی بھی خاطر خواہ گنجائش موجود تھی۔

مذکورہ لبرل آرڈر میں پہلی دراڑیں 1970ء کے اواخر سے سرمائے کی شرح منافع میں گراوٹ سے پڑنا شروع ہوئیں۔ جنہیں نیولبرل پالیسیوں کے ذریعے بھرنے کی کوشش کی گئی۔ علاوہ ازیں روس اور مشرقی یورپ میں سٹالنزم کے انہدام اور چین میں سرمایہ داری کی بحالی کے آغاز نے بھی مغربی سامراج کو کچھ نظریاتی اور معاشی سہارا دیا۔ لیکن اس تاریخی عمل میں 2008ء کا بحران ایک معیاری تبدیلی یا جست کا غماز مظہر ہے۔ جس نے روایتی سیاست (چاہے وہ بائیں بازو کے سابقہ سوشل ڈیموکریٹک رجحانات ہوں یا دائیں بازو کی لبرل پارٹیاں) کی معاشی بنیادوں کو بڑی ٹوٹ پھوٹ سے دوچار کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 2011ء کے بعد سے دنیا بھر میں جہاں احتجاجی و انقلابی تحریکوں کے ساتھ بائیں بازو کے نئے (اگرچہ بیشتر صورتوں میں اصلاح پسند) رجحانات ابھرے ہیں وہاں ایک کے بعد دوسرے ملک میں پاپولسٹ یا انتہائی دائیں بازو (فار رائٹ) کی پارٹیوں اور شخصیات کا ابھار بھی ہو رہا ہے۔ امریکہ میں اس عمل کا اظہار ڈونلڈ ٹرمپ ہے۔ جو بنیادی طور پر ایک غیر لبرل اور غیر روایتی دائیں بازو کا نمائندہ رجحان ہے۔ ریاست و معاشرت میں گہرے اثر ورسوخ کے باوجود ایسی شخصیات، جو سرمایہ داری کے بحران کا حل زیادہ رجعتی، وحشیانہ، تنگ نظر اور بیشتر صورتوں میں نسل پرستانہ پالیسیوں کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں، سامراجی نظام کے سنجیدہ پالیسی سازوں کے لئے دردِ سر بنی ہوئی ہیں۔

ٹرمپ کی مقبولیت جہاں امریکی سماج میں مسلسل شدت پکڑتی پولرائزیشن اور ہیجان کا اظہار ہے وہاں وہ اپنے لاابالی پن، ڈھٹائی، خود پسندی، بڑھک بازی اور لغویات بکنے پر مبنی رویوں کے ذریعے مکروہ لبرل سامراجی آرڈر پر چڑھے تہذیب، مفاہمت، انسانی حقوق اور جمہوریت وغیرہ کے لبادوں کو تار تار کرنے کے درپے ہے۔ یہ کوئی حادثہ نہیں ہے کہ کئی حوالوں سے نہ صرف ٹرمپ اور عمران خان کی شخصیات کے درمیان معقول موازنہ ممکن ہے بلکہ دونوں کی اقتدار سے بے دخلی کے بعد جنم لینے والے واقعات میں بھی حیران کن حد تک گہری مماثلت موجود رہی ہے۔ یہ بھی قابل غور بات ہے کہ موجودہ امریکی صدر جو بائیڈن نے واضح تنبیہ کی ہے کہ یہ انتخابات شاید پرامن نہ رہ سکیں۔ اس کیفیت کو 13 جولائی کے واقعے کے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جب امریکی معاشرہ ایک ممکنہ خانہ جنگی سے اتنا ہی دور تھا جتنی دوری سے گولی' ٹرمپ کی کھوپڑی کے پاس سے گزری تھی۔

ٹرمپ آخری تجزیے میں امریکی سامراج کا دور اندیش نمائندہ نہیں بلکہ چیزوں کو دو جمع دو چار کی زبان میں سمجھنے والا ''عملی'' سرمایہ دار ہے۔ جو سامراجی سرمایہ داری کے دور رس اہداف اور عزائم کو اگر حماقت نہیں تو ثانوی اہمیت کا حامل ضرور خیال کرتا ہے۔ ارجنٹائن سے لے کے برازیل اور امریکہ سے لے کے پاکستان تک' ایسے رجحانات کا ابھار جہاں بورژوا قیادت کے بحران کا اظہار ہے وہاں یہ بھی واضح کرتا ہے کہ سرمایہ داری کو پرانے طریقوں سے چلانا محال ہوتا جا رہا ہے۔ امریکی انتخابات کی تکنیکی تفصیلات میں جانے کی بجائے یہ حقیقت ہی کافی ہے مخبوط الحواس جو بائیڈن کو انتخابی دوڑ سے زبردستی باہر کرنے (درحقیقت لات مار کے نکالنے) اور کملا ہیرس کو ایک سیاہ فام خاتون اور نسبتاً چاک و چوبند، حاضر دماغ اور مقبول امیدوار کے طور پر ٹرمپ کے سامنے اتارنے کے باوجود مقابلہ انتہائی کانٹے دار ہو گا۔ موجودہ صورتحال میں اسرائیل کو لگام دینے میں ناکامی نے بھی ڈیموکریٹس کی ساکھ کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ بہرحال جہاں ٹرمپ کے جیت جانے کے امکانات موجود ہیں وہاں اپنی شکست کو بھی وہ آسانی سے تسلیم نہیں کرے گا۔

واقعات کی روش ہر صورت میں ایک نئے بحران کی طرف ہی جاتی ہے۔ جو سرمایہ داری کے عمومی کثیر جہتی بحران کا ہی ایک پہلو ہے۔ یہ بنیادی طور پر ایک سماجی نظام کی متروکیت اور بوسیدگی ہے جو نسل انسان کو ایک بعد دوسرے انتشار، خونریزی اور اذیت کی طرف لے جا رہی ہے اور جس سے نجات معیشت، معاشرت، سیاست اور ریاست کے موجودہ بندوبست کو ایک انقلابی انداز سے بدلے بغیر ممکن نہیں ہے۔

پاکستان

آئینی ترمیم نہیں انقلابی جراحی چاہیے!

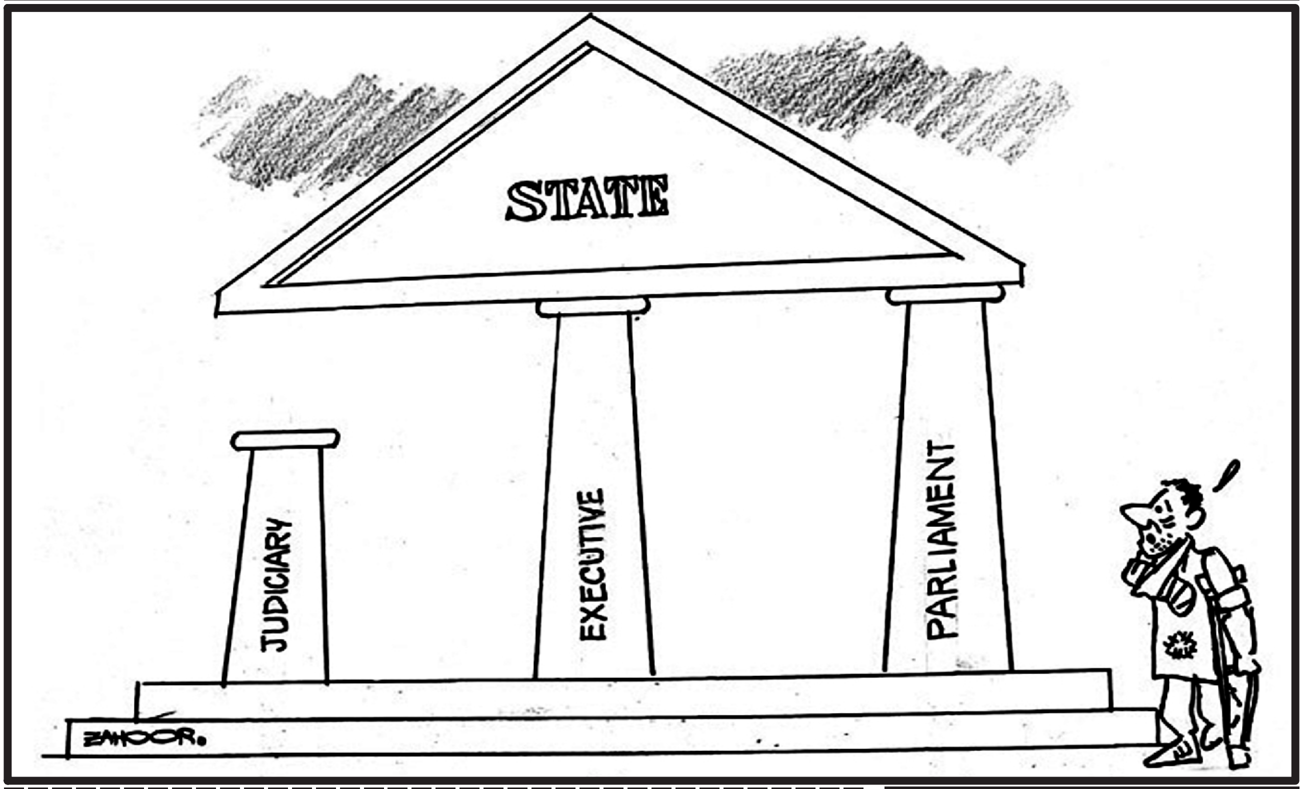

عوام کی حالت زاراور ریاست کی فرسودگی کا تقاضا ہے کہ آئینی ترمیموں کی بجائے انقلابی جراحی سے نظام کہنہ کے کینسر کا خاتمہ کیا جائے۔

تحریر: قمرالزماں خاں

21 اکتوبر کا سورج جب طلوع ہوا تو 26 ویں آئینی ترمیم پاکستان کے دونوں ایوانوں سے پاس ہو چکی تھی۔ اس ترمیم، جس کو بہت ہی پر اسرار درجہ حاصل تھا، کی گتھیاں سلجھانے میں کئی ہفتے لگ گئے۔ شروع شروع میں تو وزیر اعظم پاکستان اور قانون پاس کرانے والے متحرک وزرا کو بھی نہیں معلوم تھا کہ جس ترمیم کو وہ اپنے اتحادیوں اور دیگر پارٹیوں سے پاس کرانا چاہتے ہیں اس کے اندر کس قسم کی شقیں موجود ہیں۔ لہٰذا کہا یہ جانے لگا کہ اس ترمیم کے اندر نہ صرف لا پتہ کیے جانے کے عمل کو قانونی درجہ دیا جا رہا ہے بلکہ فوجی عدالتوں کے قیام سمیت قاضی فائز عیسیٰ کی ملازمت کو کسی نہ کسی طرح تسلسل دینا مطلوب ہے۔ شنید ہے کہ ایک مہینے میں پانچ سے سات کے قریب مختلف مسودہ جات سیاسی پارٹیوں کے سامنے لائے گئے۔ لیکن اس کا حقیقی خاکہ نویس فروغ نسیم ہے۔ اس ترمیم میں سپریم کورٹ کے سربراہ کی تعیناتی کے اختیارات پارلیمنٹ کو دینے کے ساتھ ساتھ آئینی بینچ کا قیام بھی شامل ہے۔ ایک لمبی اور تھکا دینے والی مشق کے بعد، جس میں روٹھنے اور منانے کے مضحکہ خیز مناظر بھی شامل تھے، 26 ویں آئینی ترمیم کو حتمی شکل نصیب ہوئی۔

اس دوران پسینے سے شرابور بلاول زرداری اور جھاگ اڑاتے مولانا فضل الرحمان اپنے اپنے ساتھیوں کیساتھ شقوں کی نوک پلک سنوارتے رہے۔ مولانا فضل الرحمان ہمیشہ کی طرح ہر طرف خوب کھیلے۔ 'کہیں' سے طے شدہ منصوبے کے مطابق سارا کریڈٹ مولانا کے کھاتے میں ڈالنے کا سکرپٹ' کھیل کو کامیاب بنانے کی کنجی ثابت ہوا۔ مولانا فضل الرحمان کو لگتا ہے کہ انہوں نے 26 ویں ترمیم کے اندر چھپے ہوئے بہت سے سانپ نکال باہر کیے۔ مگر یہ نکالنے کیلئے ڈالے گئے سانپ نہ ہوتے تو پھر اس زیرک سیاست دان کو ٹریپ کرنے کیلئے اس کی اور بھی بھاری شرائط ماننا پڑتی تھیں۔ لہٰذا مولانا کو جیت کے ہار پہنا کر مطلوبہ نتائج حاصل کر لیے گئے ہیں۔ بلاول اور ن لیگ کو لگتا ہے کہ اس ترمیم کے ذریعے انہوں نے چارٹر آف ڈیموکریسی کے معاہدے کی تکمیل کی ہے۔ جبکہ سی او ڈی میں ایک شق نمبر 32 بھی ہے جس میں آئی ایس آئی سمیت تمام خفیہ ایجنسیوں کو حکومتی اداروں کے ماتحت کرنے، خفیہ فنڈز، فوجی بجٹ اور الاٹ شدہ زمینوں کا آڈٹ، حکومتوں کو ہٹانے اور کارگل جنگ کی تحقیقات سمیت کئی خوفناک نکات شامل ہیں۔ جن کا ذکر تو کیا یہ پارٹیاں تصور کرتے بھی گھبراتی ہیں۔

پاکستان کی ڈیپ سٹیٹ گزشتہ کئی دہائیوں سے بے لگام عدالتی تحرک کو اپنے مقاصد کیلئے اور نام نہاد منتخب حکومتوں کی ٹانگیں کھینچنے، ان کو گرانے اور ذلیل کرنے کیلئے استعمال میں لاتی چلی آ رہی تھی۔ ایک وقت میں اس کھیل میں نواز شریف اینڈ کمپنی بھی پوری طرح شریک کار رہے۔ نواز شریف نے تو ایک بار کالا کوٹ بھی پہنا اور کورٹ پہنچ گیا۔ اگلے وقت میں ڈیپ اسٹیٹ نے ایک نیا ہائی برڈ تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کی ضروریات کے تحت نواز شریف کو نکالنے اور ذلیل کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ متوازی طور پر ایک نئی کٹھ پتلی'

عمران خان کو تیسری قوت کے طور پر لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس منصوبے کیلئے خفیہ ایجنسیوں، مقتدرہ کیلئے کام کرنے والے ''الیکٹ ایبلز'' اور عدلیہ کو پوری شدت سے استعمال میں لایا گیا۔ یہاں دھرنوں سے لے کر عدالتوں کے ریمارکس اور فیصلوں تک جو کچھ ہوتا رہا وہ پاکستان اور اس کی جوڈیشل تاریخ کا ایک اور سیاہ باب تھا۔ اگرچہ عمران خان پراجیکٹ کو کئی ادوار کا اقتدار دینے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی لیکن نہ تو اس نظام میں اتنی گنجائش تھی کہ وہ کسی بھی حکومت کو بہت زیادہ طوالت اور کامیابیاں بخشے۔ نہ ہی عمران خان اور اس کے ساتھیوں کے پاس کہنہ نظام چلانے کی صلاحیت تھی۔ لہٰذا منصوبہ شروع ہوتے ہی کھٹائی میں پڑ گیا۔ جیسے تیسے اقتدار دلانے کے بعد کے ساڑھے تین سال کی خجالت، ناکامیوں اور بدعنوانیوں کے بعد اس منصوبے کو بند کرنے کا کام شروع ہوا۔ جس میں جہاں بے پناہ وسائل اور دولت سے کرایا گیا شہرت کا سفر کاوٹیں پیدا کرنے کا باعث بنا وہاں اس ذہن سازی کو الٹانا بھی دشوار ہو گیا جو سالوں سے کی گئی تھی۔ جس میں دیگر سیاسی پارٹیوں اور افراد سے نفرت اور عمران خان کیلئے ہر جائز و ناجائز کرنے کی تربیت کی گئی تھی۔ کسی مہلک وائرس کی طرح شکلیں بدل بدل کر نمو پانے والی سوشل میڈیا ٹیموں سے لے کے خفیہ اداروں کے اہلکاروں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی مختلف صفوں میں موجود افراد اور فدائی ججوں کے خاندانوں تک ناقابل کنٹرول عوامل کو واپس کرنے میں دو سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔

26 ویں ترمیم اسی مہم کا ایک حصہ ہے جس کے ذریعے عمران خان کے حق میں فدائی ججوں کے تحرک پر کنٹرول پانا مطلوب ہے۔ اس ترمیم میں ججوں کی تقرری کا ایک پر پیچ طریقہ کار دراصل ان کو کنٹرول میں رکھ کر استعمال کرنے کیلئے ترتیب دیا گیا ہے۔ لیکن اسے استعمال کرنے کی طاقت کس کے ہاتھ میں ہو گی' اس کا فیصلہ قوتوں کا توازن مختلف طریقوں سے کیا کرے گا۔ ججوں کے من پسند چناؤ کے طریقہ کار اور الگ سے آئینی بینچ کی تشکیل کے باوجود ریاست کے اندر کی گہری دراڑوں اور نظام کی فرسودگی کی موجودگی میں سیاسی، آئینی اور انتظامی استحکام کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے۔

جہاں تک سیاسی بے چینی کا تعلق ہے تو اس کو بالائی سطح سے درست کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ سطح کے اندر بہت گہرے مسائل پچھلی کئی دہائیوں سے مسلسل بڑھتے اور پھیلتے جا رہے ہیں۔ بلوچستان میں علیحدگی پسندوں کی مسلح بغاوت' بلوچستان کی جغرافیائی باؤنڈری سے نکل کر کراچی جیسے معاشی مراکز کہلانے والے شہروں تک پہنچ چکی ہے۔ ماضی کے کنٹرولڈ/ نیم کنٹرولڈ بلوچ سردار سیاست سے متروک ہو رہے ہیں۔ جبکہ ایک نئی طرز کی سیاسی تحریک مہرنگ بلوچ کی

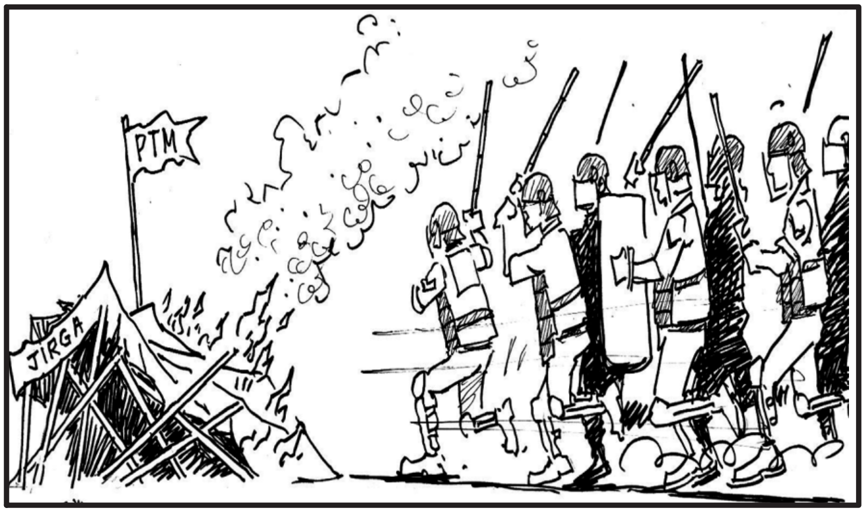

مرکزی اور صوبائی حکومت نے پی ٹی ایم پر مکمل پابندی لگاتے ہوئے اس کی تمام سرگرمیوں کو ختم کرنے کا اعلان کیا تھا' معقول مزاحمت اور سیاسی حکمت عملی سے جرگے کا انعقاد ہی ایک پیش رفت ہے۔

قیادت میں مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ نوجوان عوام کی ان پرتوں سے اٹھے ہیں جو ماضی میں کم ہی سیاسی تحرک میں نظر آتی تھیں۔ ستم رسیدہ خاندانوں کے خون سے لتھڑے پرچم اٹھائے یہ احتجاجی مارچ وہ طاقتور مظہر ہیں جس نے بہت کم عرصہ میں عوامی مقبولیت حاصل کی اور نئے سیاسی منظرنامے کو تشکیل دینے کیلئے سرگرداں ہیں۔

دوسری طرف پختونخواہ میں ایک عرصے سے جاری سماجی اور سیاسی بے چینی کا مختلف طرح سے اظہار بھی اب نئی طاقت اور نئی شکل میں ہوا ہے۔ پی ٹی ایم کی تمام تر سیاسی و نظریاتی کمزوریوں اور ابہاموں کے باوجود 10 سے 13 اکتوبر تک جاری رہنے والا قومی جرگہ کسی حد تک بالغ نظری پر مبنی مطالبات پر ختم ہوا ہے۔ ان میں فوج اور دہشت گرد تنظیموں کے دوماہ میں اخراج، سستی بجلی کی فراہمی، لوڈشیڈنگ کے خاتمے، ڈیورنڈ لائن کے آر پار آزادانہ تجارت اور آمد و رفت، فوجی عدالتوں کے خاتمے اور سیاسی قیدیوں کی رہائی جیسے مطالبات شامل ہیں۔ اگرچہ یہ مطالبات نامکمل ہیں اور پشتون عوام کی معاشی، سیاسی، صنفی اور سماجی آزادی کا حتمی فارمولا نہیں ہیں لیکن ان حالات میں جب مرکزی اور صوبائی حکومت نے پی ٹی ایم پر مکمل پابندی لگاتے ہوئے اس کی تمام سرگرمیوں کو ختم کرنے کا اعلان کیا تھا' معقول مزاحمت اور سیاسی حکمت عملی سے جرگے کا انعقاد ہی ایک پیش رفت ہے۔ جرگے کے مطالبات کی تکمیل کیلئے طے کردہ مدت ہی وہ اصل نکتہ ہے جہاں سے جرگے کے قائدین کا امتحان شروع ہوگا۔

کیا ریاست پیچھے ہٹے گی؟ فوج کے قبائلی علاقہ جات سے نکلنے کے مطالبے سے بڑا مطالبہ ان عناصر کی علاقے سے بے دخلی ہے جن کو کبھی ''گڈ'' قرار دیا گیا، کبھی تزویراتی اثاثے مانا گیا اور کبھی انہی کے خلاف آپریشن کیے گئے۔ ان مطالبات کے نہ مانے جانے اور متوقع ریاستی جبر کی صورت میں عمائدین کیا راہ اختیار کریں گے؟ یہ غور طلب سوال ہے۔ بہرحال جرگے کا پانچ روپے فی یونٹ پر بجلی کی فراہمی کا مطالبہ پورے پاکستان پر اپنے اثرات مرتب کر سکتا ہے۔

پچھلے دو سال کی پاور گیم، اکھاڑ پچھاڑ اور پکڑ دھکڑ کے کھیل کے دوران پورا پاکستان اس ٹوٹی پھوٹی سرمایہ داری کے مہلک حملوں کے سپرد ہی رہا۔ تاریخ کی بدترین مہنگائی نے آبادی کے زیادہ بڑے حصے کو غربت کی طرف دھکیل دیا۔ ملک پہلے سے زیادہ مقروض ہو گیا۔ معیشت دیوالیہ پن کی کھائی کے دہانے پر چلے جانے سے عالمی مالیاتی اداروں کی نت نئی شرائط پر مبنی بلیک میلنگ بھی عروج پر رہی۔ آئی ایم ایف کے 25 ویں پروگرام سے پہلے مسلسل بجلی اور گیس کی قیمتوں میں اضافہ، نئے ٹیکسوں کے نفاذ اور بچی کھچی رعایتوں کے خاتمے کا انت پھر نئی شرائط پر ہوا۔ نئے معاہدے کے مطابق 7 ارب ڈالر کے توسیعی فنڈ زیر 5 فیصد کی بھاری شرح

سے سود وصول کیا جائے گا۔ آئی ایم ایف کی بورڈ میٹنگ سے قبل حکومت کو 11 فیصد شرح سود سے ایک غیر ملکی بینک سے چھ سو ملین ڈالر کا قرضہ لینے پر مجبور کیا گیا۔ 1.8 ٹریلین روپے کے اضافی ٹیکس لگوائے گئے۔ بجلی کی قیمت میں 51 فیصد

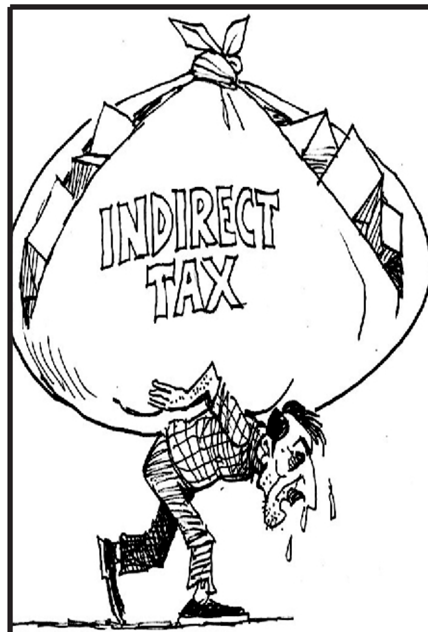

اضافہ کرایا گیا۔ زرعی انکم ٹیکس کی شرح ساڑھے 12 فیصد کی بجائے 45 فیصد کی گئی۔ اس طرح تقریباً 12 سخت شرائط رکھی گئیں۔ حکومت 4.2 فیصد بجٹ سرپلس دکھانے کی پابند ہو گی ورنہ ٹیکس دہندگان پر جی ڈی پی کا 3 فیصد اضافی ٹیکس لگے گا۔ اسی طرح 25 اداروں کی نجکاری اور صحت اور تعلیم کو پبلک سیکٹر سے نکالنے کے عمل کو تیز کرنے اور بجلی کی تقسیم کار کمپنیوں کی فروخت ایجنڈا پر ہے۔

دوسری طرف اس ملک میں نہ صرف دو کروڑ ساٹھ لاکھ بچے پرائمری تعلیم کے عمل سے باہر ہیں بلکہ یونیورسٹیوں کے فنڈز بند ہونے کی وجہ سے کئی ماہ سے اساتذہ کی تنخواہیں رکی ہوئی ہیں۔ آئی پی پیز اور پاور سیکٹر کے تمام حصوں میں ناقص پالیسیوں کی وجہ سے گردشی قرضے ہر سال بڑھتے جا رہے ہیں۔ دیار غیر میں مشکل حالات میں کام کرنے والے مزدوروں کی بھیجی گئی تقریباً تین ارب ڈالر ماہانہ کی رقم ہی زرمبادلہ کا حقیقی ماخذ ہے۔ ورنہ تجارتی عدم توازن اور کرنسی کی بے قدری کے باعث صرف قرض لے کر ہی سود اور قرض کی ادائیگی واحد طریقہ بچا ہوا ہے۔ یہ قرض ایک گھن چکر ہے جو نئے استحصالی معاہدوں، تلخ شرائط، مہنگائی اور بلیک میلنگ کے ساتھ عدم استحکام کو بڑھاتا جاتا ہے۔

پچھلے عرصے میں پاکستان کے صنعتی اور زرعی پیداواری شعبے میں مطلوبہ ترقی نہ ہو سکی بلکہ عالمی سرمایہ داری کے بحران، جنگوں اور داخلی طور پر عدم استحکام کے باعث جی ڈی پی کی شرح نمو 0.25 فیصد تھی جواب 2.38 قرار دی جا رہی ہے۔ جبکہ آبادی بڑھنے کی شرح 1.9 فیصد تک ہو چکی ہے۔ پاکستان کے حالات کی وجہ سے ہر روز یہاں سے دوسرے ممالک ہجرت کر جانے والوں کی تعداد تقریباً چار ہزار تک ہو چکی ہے۔ یہ انسانی صلاحیتوں اور مہارتوں کا بے نظیر ضیاع ہے۔

پاکستان کے دو شہر کراچی اور لاہور ڈھائی کروڑ کی آبادی کے حامل ہیں جبکہ مجموعی طور پر دس بڑے شہروں کی آبادی دس کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ آدھی سے زیادہ آبادی غربت کی لکیر سے نیچے کی زندگی گزار رہی ہے۔ بیماریاں اور معذوریاں بڑھتی جا رہی ہے۔ زیادہ تر بیماریاں گندہ پانی پینے کی وجہ سے ہوتی ہیں جبکہ 40 فیصد اموات کی وجہ بھی گندہ پانی ہے۔ ہر سال 53 ہزار بچے پانچ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی آلودہ پانی پینے سے چل بستے ہیں۔ دنیا بھر میں شوگر کے مریضوں کے حساب سے پاکستان پہلے نمبر پر ہے۔ ہر سال ڈیڑھ لاکھ افراد کے اعضا ذیابیطس کی وجہ سے کاٹے جاتے ہیں۔ ذہنی دباؤ اور ہیجان کی وجہ سے امراض قلب بھی بڑھتے جا رہے ہیں اور 29 فیصد اموات اس وجہ سے ہوتی ہیں۔ صحت اور تعلیم کے صوبائی و وفاقی بجٹ شرمناک حد تک ناکافی ہیں۔

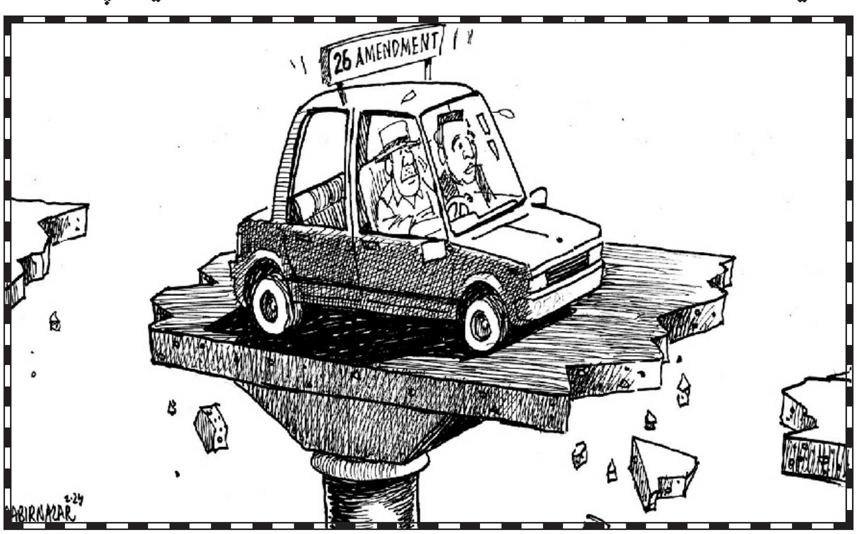

صحت کا انفراسٹرکچر ہولناک حد تک بوسیدہ ہے۔ دس ہزار انسانوں کیلئے آٹھ ڈاکٹر اور پانچ نرسز جبکہ دو ہزار لوگوں کیلئے محض ایک بستر دستیاب ہے۔ حکمران طبقہ اس صحت کے نظام کو بھی نجی تحویل میں دینا چاہتا ہے۔ تعلیم، روزگار، سڑکوں اور ٹرانسپورٹ، زراعت، صنعت اور موسمیات و ماحولیات کے شعبوں کے اعداد و شمار پاکستان کو ایک غیر صحت مند اور بحران زدہ ریاست قرار دیتے ہیں۔ شکار پور سے لے کر لاڑکانہ، سکھر، کندھ کوٹ، کشمور، گھوٹکی، رحیم یار خاں اور راجن پور تک کے اضلاع کچے کے ڈاکوؤں اور اغوا کاروں کے رحم و کرم پر ہیں۔ ریاستی رٹ' قانون نافذ کرنے والے اداروں اور ڈاکوؤں کے تعلقات کی بھینٹ چڑھ چکی ہے۔ بدمست بنیاد پرست گروہ کسی پر بھی توہین کا فتویٰ عائد کر کے سٹریٹ جسٹس شروع کر دیتے ہیں۔

یہ حالات ایک طرح کی حکمران طبقے کی بیگانگی کا مظہر بھی ہیں۔ جو خود کو کروڑوں لوگوں کی ہولناک زندگیوں سے الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد حکمران طبقے کی اس سفاکی اور بے مہری کو سمجھ رہی ہے۔ آبادی کے ایک حصے کا تحریک انصاف کی طرف مائل ہونا بھی دراصل گہرے اضطراب، غصے اور شدید ردعمل کا نتیجہ ہے جس میں وہ تحریک انصاف کی اہلیت اور ساکھ پرکھنے کی بجائے پہلے سے موجود حکمران گروہوں کے جرائم پر اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہیں۔ پاکستان کے مختلف حصوں، کشمیر اور گلگت بلتستان میں ابھرنے والی قومی اور طبقاتی تحریکوں کو الگ تھلگ نبرد آزمائی سے نکل کر نظام کی تبدیلی کے بنیادی ایجنڈے پر خود کو مجتمع کرنا ہوگا۔ سرمایہ داری اور طبقاتی تفریق کے خاتمے سے ہی ایسے عوامل کی تشکیل ممکن ہے جن کے ذریعے قومی، طبقاتی، علاقائی، صنفی، مذہبی اور دیگر بنیادوں پر ہونے والے استحصال اور بے انصافی کا خاتمہ کرتے ہوئے تمام وسائل کو بہتر انسانی زندگی کی تعمیر کے لئے بروئے کار لایا جا سکے گا۔ عوام کی حالت زار اور ریاست کی فرسودگی کا تقاضا ہے کہ آئینی ترمیموں کی بجائے انقلابی جراحی سے نظام کہنہ کے کینسر کا خاتمہ کیا جائے۔

مشرق وسطیٰ میں نیا کہرام: صورتحال اور امکانات

عمران کامیانہ

(زیرِ نظر مضمون 9 اکتوبر کو انگریزی زبان میں 'ایشین مارکسسٹ ریویو'، 'انٹرنیشنل سوشلسٹ لیگ' اور دوست تنظیموں کی دوسری ویب سائٹوں پر شائع ہوا۔ جس کے بعد سے حماس کے رہنما یحییٰ سنوار کے قتل سمیت غزہ اور لبنان میں اسرائیل کی بے دریغ وحشت اور دہشت گردی کا سلسلہ جاری ہے۔ مضمون میں مشرقِ وسطیٰ کے موجودہ حالات کے پس منظر، تازہ صورتحال اور مستقبل کے امکانات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔)

7 اکتوبر 2023ء سے مشرق وسطیٰ میں ابھرنے والا نیا بھونچال نہ صرف تھمنے کا نام نہیں لے رہا بلکہ تباہی اور خونریزی کی شدت اور وسعت میں مزید اضافے کے امکانات بھی اپنی پرانتشار اور تضادات سے بھرپور کوکھ میں سمیٹے ہوئے ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کی واحد فنکشنل 'جمہوریت' اسرائیل کا وزیراعظم نیتن یاہو، جو بنیادی طور پر ایک چھٹا ہوا سامراجی بدمعاش، عادی جنگی مجرم اور کٹر صیہونی ہے، شیشے کے برتنوں کی دکان میں گھسے بدمست گینڈے کی طرح اشتعال انگیزی، شرارت اور بربادی کی ہر حد کو عبور کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ حالیہ جارحیت کے پہلے صرف چھ مہینے کے دوران صیہونی ریاست' غزہ پر 70 ہزار ٹن بارود برسا چکی تھی جو پوری دوسری عالمی جنگ کے دوران برطانیہ اور جرمنی کے بڑے شہروں پر ہونے والی مجموعی بمباری سے زیادہ بنتا ہے۔ اس کے بعد سے اب تک کے تقریباً چھ مہینوں کے دوران برپا کی جانے والی وحشت اس سے زیادہ ہی ہو گی۔ جس نے سکولوں، ہسپتالوں، رہائشی عمارتوں اور دوسرے بنیادی انفراسٹرکچر سمیت غزہ کی پٹی کو عملاً ملبے کے ایک ڈھیر میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

پچھلے 12 مہینوں کے دوران 43 ہزار سے زائد فلسطینی اسرائیلی افواج کی فضائی بمباری اور زمینی کاروائیوں میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ جن میں سے (انتہائی محتاط اندازوں کے مطابق بھی) 90 فیصد عام شہری جبکہ 60 فیصد سے زائد بچے، بوڑھے اور خواتین ہیں۔ آکسفیم کے مطابق یہ حالیہ تاریخ کے کسی بھی تنازعے میں مارے جانے والے انسانوں میں خواتین اور بچوں کی سب سے بلند شرح ہے۔ ہلاک ہونے والوں میں تقریباً ڈیڑھ سو صحافی اور 225 امدادی سرگرمیاں انجام دینے والے کارکنان بھی شامل ہیں۔ زخمی یا عمر بھر کے لئے اپاہج ہو جانے والے تقریباً ایک لاکھ افراد اس کے علاوہ ہیں۔ مزید برآں صیہونی جارحیت کے نتیجے میں بالواسطہ وجوہات (علاج معالجے کی عدم فراہمی، غذائی قلت وغیرہ) سے ہونی والی ہلاکتوں کو شمار کریں تو جانی نقصان اس سے کئی گنا بڑھ سکتا ہے۔ برطانوی جریدے 'لانسٹ' کے مطابق فلسطینی ہلاکتوں کی تعداد ایک لاکھ 86 ہزار بنتی ہے۔ امریکی آبادی میں اگر اس شرح سے ہلاکتیں ہوں تو ان کی تعداد دو کروڑ 80 لاکھ ہو گی!

یہ نہ رکنے والا قتل عام جمہوریت اور انسانی حقوق کی علمبردار 'مہذب' سرمایہ دارانہ دنیا کے رکھوالوں کی نظروں کے سامنے ہی نہیں بلکہ ان کی پوری آشیرباد، معاونت اور پشت پناہی سے ہو رہا ہے۔ لیکن مسئلہ صرف اتنا بھی نہیں ہے۔ نیتن یاہو کی پوری کوشش ہے کہ صیہونی یلغار کو ہر ممکن حد تک پھیلا کے ایک بڑی علاقائی جنگ میں بدلا جائے۔ رواں سال اپریل میں دمشق (شام) میں ایرانی سفارتخانے پر حملہ، جولائی میں تہران میں حماس کے قائد اسماعیل ہانیہ کا قتل، حالیہ ہفتوں میں حزب اللہ کے مواصلاتی آلات میں دھماکے، دارالحکومت بیروت اور ملک کے جنوبی علاقوں سمیت لبنان پر فضائی حملوں میں شدت (جس میں تین دہائیوں سے حزب اللہ کے سربراہ حسن نصراللہ سمیت تنظیم کے کئی اہم رہنماؤں کو بھی قتل کر دیا گیا) اور اب جنوبی لبنان پر زمینی چڑھائی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان حالیہ کاروائیوں کے نتیجے میں لبنان میں ہلاکتوں کی تعداد پہلے ہی دو ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ جبکہ دس لاکھ لوگ ہجرت پر مجبور ہو گئے ہیں۔ جس وقت یہ سطور تحریر کی جا رہی ہیں' اسرائیل مرکزی بیروت پر بمباری کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے اور ہلاکتوں کی تعداد مسلسل

بڑھ رہی ہے۔ انتہا درجے کی سرد مہری، اشتعال انگیزی اور ڈھٹائی پر مبنی صیہونی ریاست کی یہ کاروائیاں اس قدر غیر متوقع اور اچانک رہی ہیں کہ شاید حماس اور حزب اللہ کے قتل ہونے والے مرکزی رہنما خود بھی اپنی ہلاکتوں کی توقع یا پیش بینی سے قاصر تھے۔ بلکہ کئی صورتوں میں تو اسرائیل کی پشت پناہ مغربی سامراجی ریاستیں بھی تذبذب، حیرانی اور ''شاک'' پر مبنی کیفیت کا شکار نظر آتی ہیں۔ جس میں خود امریکی سامراجی اسٹیبلشمنٹ کے بیشتر حصے بھی شامل ہیں۔

سوال یہ بھی ہے کہ آخر نیتن یاہو کا ٹولہ خود سامراجی ورلڈ آرڈر کی تمام تر اخلاقیات، قوانین اور حدود کو پامال کرنے پر کیوں بضد ہے۔ عالمی منظر نامے میں سلگتے بین السامراجی تضادات، اسرائیل کی داخلی سیاست اور مغربی سامراج بالخصوص امریکہ کے اپنے داخلی بحران اور زوال پذیری کو مدنظر رکھے بغیر اس پہیلی کو سلجھانا ممکن نہیں ہے۔ ہم نے اپریل 2024ء کی ایک تحریر میں معاملے کے بنیادی پہلو اور آگے کے امکانات کا احاطہ کچھ ان الفاظ میں کیا تھا:

''حماس کو کچلنے میں ناکام نیتن یاہو... اب غزہ میں جاری قتل و غارت گری کو ایران کیساتھ ایک کھلی جنگ کی صورت پورے خطے میں پھیلانے کے درپے ہے۔ کیونکہ مسلسل جنگی حالات ہی اس کے اقتدار میں رہنے کی ضمانت ہیں۔ بصورت دیگر کرپشن کے سنگین مقدمات بھگت رہا ہوگا۔ لیکن اس بنیادی مقصد سے ہٹ کے بھی امریکہ سمیت مغربی سامراج کو خطے میں براہِ راست مداخلت اور اسرائیل کی بھرپور پشت پناہی پر مجبور کرنے، غزہ میں جاری بربریت سے دنیا کی توجہ ہٹانے اور ایران کے ایٹمی پروگرام کو تباہ کرنے جیسے عزائم اسرائیل کی حالیہ اشتعال انگیزیوں کے پیچھے کارفرما ہیں... اس صورت میں ممکنہ جنگ کے بالکل بے قابو ہو کر نہ صرف سارے مشرقِ وسطیٰ بلکہ اس سے باہر بھی پھیل جانے، ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال، خطے کی رجعتی اور عوام دشمن ریاستوں کے خلاف لوگوں کا غم و غصہ بغاوتوں کی شکل میں پھٹ پڑنے اور پہلے سے زبوں حالی کا شکار عالمی معیشت کے گہرے بحران میں دھکیلے جانے جیسے خدشات کے پیش نظر تمام سامراجی طاقتیں بشمول امریکہ، یورپ، روس اور چین اسرائیل کو مزید کسی اشتعال انگیزی سے منع کر رہی ہیں۔ لیکن یہ انتباہ، تاکیدیں اور اپیلیں نیتن یاہو کے باز رہنے کی ضمانت نہیں ہیں۔''

صیہونی ریاست کا بحران

یہ درست ہے کہ ملک کے اندر یا باہر خود پر کسی حملے کی صورت میں انسانی جان و مال کی قیمت سے 'قطع نظر کئی گنا' بلکہ درجنوں گنا سخت جواب دینا اسرائیل کی پرانی پالیسی رہی ہے۔

لیکن اگر ایک وسیع تاریخی تناظر میں دیکھیں تو یہ ساری صورتحال صیہونی ریاست کے اپنے داخلی بحران اور ملک کی سیاسی و نظریاتی سمت کو لے کے اسرائیلی سماج میں موجود گہری تقسیم کے ناگزیر نتیجے کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ایک طرف مڈل کلاس یورپی یہودیوں وغیرہ پر مبنی آبادی کے وہ سیکولر، لبرل حصے ہیں جو صیہونی ریاست کو ایک جمہوری اور 'پلورلسٹ' معاشرے کے طور پر آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف فلسطینی زمینوں کو ہتھیانے والے قبضہ گیر، نوآبادکار اور قدامت پرست سماجی دھڑے ہیں جو اپنے قدیم مذہبی صحیفوں کی تعلیمات اور پیش گوئیوں کی روشنی میں اسرائیل کو ایک یہودی تھیوکریٹک ریاست میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ جس کے لئے وہ اسرائیل کے جغرافیائی پھیلاؤ، ہمسایہ خطوں پر قبضے، فلسطینیوں کی نسل کشی اور بے دخلی کی ہر حد تک جانے کو تیار ہیں۔

گزشتہ ایک ڈیڑھ دہائی کے دوران موخرالذکر رجحانات کا اثر و رسوخ ملک کی سرکاری مشینری اور سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ میں تیزی سے بڑھنے کی طرف گیا ہے اور اسرائیلی ریاست دائیں بازو کی طرف جھکتے چلے جانے کے مسلسل عمل کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ رجعتی اور وحشی ہوتی گئی ہے۔ اس صورتحال کو دنیا بھر میں 'فار رائٹ' کے ابھار کے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ نتیجتاً اس وقت نیتن یاہو کے اتحادیوں، حکومتی اہلکاروں اور کابینہ میں بیٹھے لوگوں (ڈینیل ہاگاری، یواف گیلنٹ، بن گویر، بیزالل سموترچ وغیرہ) کو صیہونی داعش یا طالبان کہا جائے تو یہ قطعاً کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہو گی۔ نیتن یاہو سمیت یہ پورا ٹولہ تاریخی صیہونی پراجیکٹ کو زیادہ جبر سے لاگو کرنے اور اسرائیلی ریاست کو ایک زیادہ فسطائی ساخت اور ہیئت میں ڈھالنے کے درپے نظر آتا ہے۔ جس میں جمہوری آزادیوں پر قدغنیں اور عدلیہ کے اختیارات کو محدود کرنے جیسے اقدامات بھی شامل ہیں۔ اس سارے عمل کے خلاف اپوزیشن کی نسبتاً لبرل پارٹیوں اور عام اسرائیلی شہریوں کی مزاحمت اور ایجی ٹیشن بھی احتجاجی مظاہروں کی شکل میں جاری رہی ہے۔ 7 اکتوبر کے واقعات نے اس سلسلے کو اگرچہ وقتی طور پر منقطع کر دیا اور ملکی دفاع و وطن پرستی کے جذبات غالب آ گئے۔ لیکن تلخ معاشی حالات اور مسلسل غیر یقینی صورتحال میں یہ تضادات دوبارہ بھڑک رہے ہیں۔ جس کا اظہار حماس کے قبضے میں موجود اسرائیلی قیدیوں کی ہلاکتوں کے نتیجے میں نیتن یاہو کے خلاف ہونے والے پر تشدد مظاہروں اور یکم ستمبر کو ہونے والی آٹھ گھنٹے کی عام ہڑتال کی شکل میں ہوا ہے (جسے سپریم کورٹ کے ذریعے ختم کروایا گیا) اور آگے اس سے بھی زیادہ شدت سے ہو سکتا ہے۔

اسرائیلی معیشت کی حالت بھی بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔ پچھلے سال کے صرف آخری تین مہینوں کے دوران معیشت کا حجم 20 فیصد سکڑا ہے۔ یہ بڑی معاشی گراوٹ ہے جو وقتی بحالی کے باوجود موجودہ حالات میں جاری ہی رہے گی۔ فی کس جی ڈی پی اور آمدن کے اعتبار سے اسرائیل اگرچہ ایک بڑے معاشی حجم کا حامل امیر ملک ہے اور تکنیکی حوالے سے بھی خاصا ترقی یافتہ ہے۔ لیکن یہ ساری ترقی و خوشحالی بڑی حد تک مغربی سامراج' بالخصوص امریکہ کی امداد و سرمایہ کاری کی محتاج ہے۔ واضح رہے کہ اسرائیل تاریخی طور پر امریکی امداد کا سب سے بڑا وصول کنندہ ہے جو 1946ء سے اب تک 300 ارب ڈالر سے زائد امداد کی مد میں وصول کر چکا ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے امریکہ ہر سال چار تا پانچ ارب ڈالر اسرائیل کو صرف عسکری امداد کی مد میں ادا کرتا ہے۔ جبکہ اس سال تقریباً 13 ارب ڈالر اس مد میں ادا کیے جائیں گے۔ ایک کروڑ سے بھی کم آبادی کے ملک کے لئے یہ بہت بڑا مالیاتی حجم بنتا ہے۔ لیکن مسلسل اور براہِ راست جنگ کے حالات بڑی سے بڑی معاشی طاقت کو بھی ناقابل برداشت خساروں اور قرضوں میں مبتلا کر کے اندر سے کھوکھلا کر سکتے ہیں۔

ایس اینڈ پی اور موڈیز جیسے اداروں نے ایران کے یکم اکتوبر کے میزائل حملے کے بعد اسرائیل کی کریڈٹ ریٹنگ میں کمی کی ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ جنگ اگر جاری رہتی ہے تو اس کی قیمت جی ڈی پی کے 10 فیصد تک بھی جا سکتی ہے۔ موجودہ حالات میں بہت سے سرمایہ دار اپنا سرمایہ اسرائیل سے باہر منتقل کرنے کی طرف بھی جا رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ امریکی سامراج' اسرائیلی صیہونی ریاست کو مشرق وسطیٰ میں اپنی چوکی' بلکہ شاید اپنی 'ایکسٹینشن' کے طور پر دیکھتا ہے اور ہر حالات میں اسے بیل آؤٹ کرنے کو تیار ہو گا۔ لیکن حالات زیادہ خراب ہوتے ہیں تو اس کے لئے زیادہ سے زیادہ سرمایہ درکار ہو گا جس کی فراہمی عالمی سرمایہ دارانہ معیشت کے عدم استحکام کے موجودہ حالات میں یقیناً آسان نہیں ہو گی۔

صیہونی ریاست کے بحران کا ایک اور پہلو عالمی سطح پر اس کی بڑھتی ہوئی تنہائی بھی ہے۔ خود مغربی سامراجی اسٹیبلشمنٹ کے کھلاڑی اور پسماندہ خطوں میں ان کی کٹھ پتلیاں اسرائیل کے حق میں تمام تر بڑھک بازی یا اس کے جرائم پر خاموشی کے باوجود نیتن یاہو کی روش سے بیزار نظر آتے ہیں۔ اس صورتحال کا اظہار اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں نیتن یاہو کی حالیہ تقریر کے دوران بھی ہوا۔ جہاں بیشتر مندوبین کے واک آؤٹ کے بعد اسے خالی کرسیوں سے خطاب کرنا پڑا۔ اگرچہ مخصوص فرعونی لہجے میں اس کی بکواس مسلسل جاری رہی۔

باقی مضمرات کے علاوہ مشرق وسطیٰ میں بڑی جنگ ناگزیر طور پر پہلے سے زبوں حال عالمی معیشت پر انتہائی مضر

اثرات مرتب کرے گی۔ تیل کی قیمتیں آسمان تک پہنچ جائیں گی اور اقتصادی عدم استحکام کا نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ لیکن اس سے بڑھ کر شاید سامراجیوں کو اپنی عام آبادی' بالخصوص نوجوانوں کی طرف سے دباؤ، نفرت اور حقارت کا سامنا ہے۔ فلسطینیوں کی نسل کشی اور مسلسل بدمعاشی پر مبنی صیہونی ریاست کا طرزِ عمل پوری دنیا میں سامراجی منافقت کے خلاف شدید غم و غصے کو جنم دے رہا ہے۔ جس کا اظہار احتجاجی مظاہروں اور سوشل میڈیا ایکٹوزم وغیرہ پر مبنی بین الاقوامی یکجہتی کی مہم کی شکل میں بھی ہو رہا ہے۔ 'یوگوو' (YouGov) کی جانب سے پانچ یورپی ممالک (اٹلی، بیلجئم، سویڈن، فرانس، جرمنی) میں کی جانے والی ایک رائے شماری کے مطابق ووٹ ڈالنے کی اہل آبادی کا کم از کم نصف حصہ اسرائیل کو ہتھیاروں کی فراہمی بند کرنے کا حامی ہے۔ جن میں اکثریت نوجوانوں کی ہے۔ جبکہ اس سے بھی بڑی تعداد میں لوگ اسرائیل پر پابندیاں لگانے کے حق میں ہیں۔ یہ نتائج پوری دنیا میں عام لوگوں کی رائے عامہ میں ایک بڑی شفٹ کی غمازی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ حالات و واقعات اسرائیل سے باہر یہودی نوجوانوں کی بڑی تعداد کو بھی صیہونیت سے دور ہونے پر مجبور کر رہے ہیں۔ جو اسرائیل کی بین الاقوامی ساکھ کے لئے دھچکے سے کم نہیں ہے۔

خود اسرائیل میں تمام تر جنگی جنون کے باوجود نیتن یاہو کی پوزیشن بہت مستحکم نہیں ہے۔ حسن نصراللہ کے قتل کے بعد اس کی مقبولیت میں کچھ اضافہ ضرور ہوا ہے۔ لیکن اسرائیل کے 'چینل 12' کی ایک حالیہ رائے شماری کے مطابق اگر آج انتخابات ہوں تو نیتن یاہو کا اتحاد پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل نہیں کر سکے گا۔ آنے والے دنوں میں جنگ کی تباہ کاریاں نیتن یاہو کی مقبولیت میں مزید کمی کا باعث ہی بنیں گی۔ جس کا ازالہ کرنے کے لئے وہ مزید جارحیت اور مہم جوئی پر مجبور ہو گا۔ یوں ان حالات میں نیتن یاہو اور اس کے ٹولے کی سیاسی بقا کی واحد ضمانت جنگ کا تسلسل ہے۔ بنیادی طور پر درندہ صفت انسانوں کا یہ گروہ ایسی ڈھلوان پر بھاگ رہا ہے جس کی مزاحمت کی صورت میں منہ کے بل لڑھک جائے گا۔ لیکن اس دوڑ کا حتمی انجام بھی تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ویسے اگر غور کریں تو تاریخی طور پر فسطائی یا نیم فسطائی رجحانات (جن میں آج کل کے بیشتر پاپولسٹ اور فار رائٹ کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے) کے بیشتر رہنما اسی المیے کا شکار نظر آتے ہیں۔

نیتن یاہو کی کرسی خود اس سے بھی بڑے پاگلوں اور جنونیوں کے سہارے پر ٹکی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اتحادیوں کے خلاف جا کے کوئی معقول طرزِ عمل اپنانے کا نہیں سوچ سکتا۔ فراڈ اور رشوت ستانی کے سنگین الزامات کے تحت حکومت سے باہر ہوتے ہی اسے جیل کی ہوا اور عدالتوں کے دھکے کھانے پڑ سکتے ہیں۔ لیکن اس سے ہٹ کے بھی شاید وہ اسرائیل کے دشمنوں کی ہر ممکن حد تک خونریزی اور بربادی کی قیمت پر جنگی فتح کے ذریعے 'فیلڈ مارشل' جیسا رتبہ حاصل کرنے یا تاحیات اقتدار میں رہنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس ساری منصوبہ بندی میں بالآخر غزہ سے تمام فلسطینی آبادی کا انخلا بھی شامل ہے۔ جس کی طرف ابتدائی اقدامات اٹھائے جا چکے ہیں۔ لیکن اکثر جنگوں کے مضمرات اور نتائج موضوعی خواہشات سے خاصے مختلف ہوتے ہیں۔

امریکی سامراج کا زوال

موجودہ صورتحال کی تشکیل میں امریکی سامراج کی تاریخی گراوٹ اور سامراجی اسٹیبلشمنٹ میں موجود گہری تقسیم بھی اہم عنصر کے طور پر شامل ہے۔ ایک طرف معاشی یا اقتصادی حوالے سے چین کے مقابلے میں امریکہ کا نسبتی زوال ہے۔ چین اس وقت لاطینی امریکہ، افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ (مجموعی طور پر دنیا کے 120 ممالک) کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر ہے اور اپنی بیرونی سرمایہ کاری میں روز افزوں اضافہ کر رہا ہے۔ دنیا میں اس کے مسلسل بڑھتے مالیاتی حجم اور اقتصادی اثر و رسوخ کا ناگزیر مطلب سیاسی و سفارتی وزن میں اضافہ ہے۔ جس نے سنجیدہ سامراجی پالیسی سازوں کے اوسان خطا کیے ہوئے ہیں اور جس کا ازالہ وہ عسکری دھونس کے ذریعے کرنے کی کوشش میں ہیں۔

لیکن عراق اور افغانستان میں امریکہ کی براہِ راست ذلالت، شام میں بالواسطہ شکست اور دوسری بیشتر صورتوں میں معاملات کو کنٹرول نہ کر پانے کی خجالت نے امریکی سامراج کی ساکھ، رعب و دبدبے اور اس کے پالیسی سازوں کے اعتماد اور حوصلے کو گہری چوٹ پہنچائی ہے۔ شاید یہ بھی ایک وجہ ہے کہ وہ فی الوقت اسرائیل کے چکر میں مشرقِ وسطیٰ میں کسی بڑے جنگی تنازعے کے براہِ راست فریق بننے سے کترا رہے ہیں۔

پھر ٹرمپ کا مسئلہ ہے۔ جو ایک 'آؤٹ سائیڈر' ہونے کے باوجود امریکی آبادی کے بڑے حصے کی حمایت اور مروجہ سیاست و ریاست کے اندر گہرا اثر و رسوخ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے، دہائیوں میں تعمیر کیے گئے عالمی لبرل آرڈر کو تہس نہس کرنے کے درپے ہے اور سنجیدہ سامراجی پالیسی سازوں کے لئے ایک مسلسل دردِ سر بنا ہوا ہے۔ اسرائیل کی طرح امریکہ میں بھی یہ صورتحال گہری سماجی بے چینی اور تقسیم کی غماز ہے اور امریکی حکمران طبقے و ریاست کو مسلسل تذبذب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔

لیکن پھر دنیا کی سب سے بڑی معاشی اور عسکری قوت اور واحد سپر پاور کے سربراہ کی اپنی حالت پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جو ایک انسانی شکل میں مذکورہ سامراجی ورلڈ آرڈر کی زندہ لاش معلوم ہوتا ہے۔ جسے آئندہ امریکی صدارتی انتخابات کی دوڑ سے نکالنے کے لئے پہلے منت ساجت سے کام لینے کی کوشش کی گئی لیکن آخر کار تقریباً لات مار کے باہر کرنا پڑا۔ یہ بھی کیسی مضحکہ خیز قسم کی ستم ظریفی ہے کہ کم از کم شروعات میں ڈیموکریٹک پارٹی کی اسٹیبلشمنٹ سنجیدگی سے جو بائیڈن کو ڈونلڈ ٹرمپ کے مقابلے میں اتارنے کا سوچ رہی تھی۔

لیون ٹراٹسکی نے مختلف تاریخی ادوار اور نظاموں کی اہم شخصیات (چاہے ان کے بیچ زماں و مکاں میں سینکڑوں سال اور ہزاروں میل کا فاصلہ ہی کیوں نہ ہو) کی ثقافتی و نفسیاتی مماثلت پر تبصرہ کرتے ہوئے واضح کیا تھا کہ ایک جیسے حالات انسانوں کو ایک جیسا ردِ عمل دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور حالات کا جبر جتنا شدید ہوتا ہے' انسانوں کے پاس مختلف طرزِ عمل اپنانے کی گنجائش اتنی ہی محدود ہوتی ہے۔ اس تناظر میں جو بائیڈن کا موازنہ بالکل بجا طور پر لیونڈ برژنیف سے کیا جا سکتا ہے۔ جو سوویت یونین میں سٹالنزم کی زوال پذیری اور سٹالنسٹ بیوروکریسی کے خود اپنے نظام کے اوپر بڑھتے ہوئے عدم اعتماد کا شخصی اظہار تھا۔ اس کے بڑھاپے، بھلکڑ پن اور مخبوط الحواسی کو لے کے سوویت یونین میں کئی سیاسی لطیفے مشہور تھے۔ جن میں سے ایک کے مطابق جب برژنیف نے اپنی تقاریر لکھنے پر معمور پارٹی عہدیدار کو ڈانٹا کہ میں نے تمہیں پندرہ منٹ کی تقریر لکھنے کو کہا تھا' تم نے پینتالیس منٹ کی کیوں لکھی تو اس بیچارے نے عرض کی کہ جناب میں نے آپ کو پندرہ منٹ کی تقریر کی تین کاپیاں دی تھیں۔ جو بائیڈن کی ذہنی و جسمانی حالت بھی برژنیف سے کوئی زیادہ مختلف نہیں ہے۔ شاید آج کے امریکی سامراج اور آخری دہائیوں کے سوویت یونین کے درمیان بھی کم از کم جزوی تمثیل یا انالوجی قائم کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ دونوں ریاستیں بالکل مختلف بلکہ متضاد سماجی نظاموں کی نمائندہ تھیں۔

ان حالات میں امریکی ریاست کی پالیسی سازی اور پھر اپنی پالیسیوں کو نافذ کروانے کی صلاحیت کا اندازہ لگانا محال نہیں ہے۔ متضاد بیانات، بے بسی اور تذبذب کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو اسرائیل کی بھرپور اور غیر مشروط حمایت کے بیانات سے غیر اعلانیہ یا نیم مذمت تک چلا جاتا ہے (جس میں کبھی ہتھیاروں کی سپلائی بند کرنے کی نیم دلانہ دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں)۔ اسرائیل کے سامنے ایک ریڈ لائن کھینچتے ہیں۔ جب وہ اسے عبور کر لیتا ہے تو دوسری کھینچ

دیتے ہیں۔ لکیریں کھینچنے اور مٹانے کا یہ سلسلہ پچھلے ایک سال سے جاری ہے۔ جس کے پیچھے محض منافقت کا عنصر ہی کارفرما نہیں ہے۔ جو بائیڈن کی ذہنی حالت کے پیش نظر اس کی عملداری یا اتھارٹی ناپید نہیں تو انتہائی محدود ضرور ہے۔ یوں بطور امریکی صدر اس کی اہمیت زیادہ تر علامتی ہی ہے۔

اسی دوران صدارتی انتخابات کی مہم کا شور وغوغا جاری ہے۔ بائیڈن نے ایک سنگین وارننگ میں واضح کیا ہے کہ اس بار ضروری نہیں کہ امریکی انتخابات پرامن ہی ہوں۔ ٹرمپ اگر ہارتا ہے تو آسانی سے اپنی شکست تسلیم نہیں کرے گا۔ لیکن اگر جیت جاتا ہے تو یہ بھی کوئی چھوٹا مسئلہ نہیں ہے۔ ہر صورت میں یہ ایک پکتا ہوا بحران ہے۔ نتیجتاً ریاستی و عسکری افسر شاہی کا کردار لامحالہ طور پر بڑھ جاتا ہے جس میں بائیڈن سے بھی بڑے جنگی قاتلوں اور جنونیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

موجودہ حالات کا بھرپور فائدہ ٹرمپ بھی اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس نے اسرائیل پر ایران کے تازہ میزائل حملے کے بعد دلچسپ تبصرہ کیا:

''دنیا کے حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے ایران نے اسرائیل پر 200 بیلسٹک میزائل پھینکے ہیں اور ہم ایک عالمی تباہی کے اتنے قریب پہنچ گئے جتنے پہلے کبھی نہیں تھے۔ ہمارا ایک صدر ہے جو ویسے ہی غائب ہے اور ایک نائب صدر ہے جسے معاملات کو سنبھالنا چاہئے۔ لیکن وہ سانفرانسسکو میں (اپنی انتخابی مہم کے لئے) فنڈ اکٹھے کرتی اور تصویریں کھینچتی پھر رہی ہے۔ کسی کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے اور یہ بھی نہیں پتا کہ کون زیادہ کنفیوژ ہے: بائیڈن یا کمالا۔ دونوں کو نہیں معلوم کہ ہو کیا رہا ہے۔''

سیاسی پوائنٹ سکورنگ اور مبالغہ آرائی سے قطع نظر ٹرمپ کا یہ تبصرہ کچھ ایسا نامعقول بھی نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خود صدر ہوتا تو اسے بھی پتا نہ ہوتا کہ ''ہو کیا رہا ہے'' اور کرنا کیا ہے۔ بلکہ ایسے لوگ اپنے ڈھٹائی اور حماقت پر مبنی 'کانفیڈنس' میں زیادہ تباہ کن حرکتیں کر بیٹھتے ہیں۔ ایسا ہی ایک ہرفن مولا پاکستان کی اڈیالہ جیل میں بھی سڑ رہا ہے۔

بہرحال مشرق وسطیٰ کی موجودہ صورتحال میں امریکی پالیسی کے بنیادی نکات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ واضح ہے کہ امریکہ' اسرائیل کی حمایت، پشت پناہی و امداد سے کسی صورت پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ لیکن موجودہ حالات میں امریکی' اسرائیل کو خطے میں کوئی بڑی جنگ بھی کھولنے دینا نہیں چاہتے۔ بالخصوص ایک ایسا تصادم جس میں ایران براہ راست ملوث ہو۔ کیونکہ اس صورت میں وسیع پیمانے کی ہجرتوں، معاشی بحران اور تباہی کا ایسا سلسلہ شروع ہو سکتا ہے جو بعض صورتوں میں بالکل بے قابو ہو کے جوہری ہتھیاروں کے استعمال تک جا سکتا ہے (یاد رہے کہ اسرائیل کی پالیسی ہے کہ کسی وجودی خطرے کی صورت میں وہ جوہری ہتھیاروں کے استعمال سے نہیں کترائے گا)۔ علاوہ ازیں وہ بطور فلسطینی آبادی غزہ (یا مغربی کنارے) کا خاتمہ یا اسرائیل میں ادغام بھی نہیں چاہیں گے۔ کم از کم ایسے یکلخت اور تباہ کن انداز سے نہیں جیسے کہ نیتن یاہو جیسوں کی خواہش ہے۔ کیونکہ ایسا کوئی بھی اقدام نہ صرف دو ریاستی حل کی دہائیوں سے تخلیق کردہ منافقت کو ہمیشہ کے لئے تاریخ کے کوڑے دان میں ڈال دے گا بلکہ عرب آبادیوں میں پہلے سے موجود شدید غم و غصے کو نقطہ اشتعال تک پہنچا کے خطے میں بغاوتوں، سیاسی عدم استحکام اور ریاستوں کے دھڑن تختوں کے نئے سلسلے کا آغاز کر سکتا ہے۔ اس حوالے سے چین، یورپی طاقتیں اور بیشتر عرب ریاستیں' امریکیوں کی ہم خیال نظر آتی ہیں۔ اسی لئے ہر

اشتعال انگیزی کے بعد ہر طرف سے ''ہر ممکن حد تک صبر و تحمل' کی اپیلیں جاری ہوتی ہیں۔ اگرچہ سعودی حکمرانوں کی دلی خواہشات کا معاملہ مختلف ہو سکتا ہے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ نیتن یاہو امریکیوں کی وضع کردہ حدود میں رہنے کو تیار نہیں ہے اور امریکی چار و ناچار اس کی ہر ضد کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ یوں اسرائیل کی حمایت اور نیتن یاہو کی سرزنش کے درمیان توازن قائم کرنا امریکیوں کے لئے ناممکن ثابت ہو رہا ہے۔ اگر غور کریں تو پچھلے ایک سال کے دوران حالات و واقعات کی سمت کے تعین میں امریکہ کا کردار کسی متحرک پلیئر سے زیادہ نیم مجہول تماشائی کا رہا ہے۔ نیتن یاہو کو اپنی پیروی پر مجبور کرنے کی بجائے عملاً وہ اس کی کھینچی ہوئی لکیروں کے فقیر بن کے رہ گئے ہیں۔ اور یہ راستہ کسی امن و استحکام کی منزل کی جانب ہرگز نہیں جاتا۔ کسی انتہائی صورتحال میں نیتن یاہو کو جسمانی یا سیاسی طور پر راستے سے ہٹائے جانے کی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کام نہ تو آسان ہوگا' نہ خطرات سے خالی۔

ایران کا المیہ

گزشتہ ایک سال کے دوران اسرائیل کی پوری کوشش رہی ہے کہ حماس کے خلاف آپریشن کو خطے میں ایرانی پراکسیوں (حوثی، حزب اللہ وغیرہ) کے خلاف کارروائیوں تک توسیع دے کر ایران کے پر کترے جائیں اور ہر ممکن حد تک ایران کو ایک کھلی جنگ میں گھسیٹنے کی کوشش کی جائے۔ جس میں ایران کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا جائے۔ جبکہ ایران کی اسی قدر کوشش رہی ہے کہ اسرائیل کے ساتھ براہِ راست جنگ میں جانے سے گریز کرے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔

اسرائیل اور امریکہ کی طرح ایرانی ریاست خود ایک گہرے داخلی بحران سے دوچار ہے۔ ریاستی طاقت کیساتھ نتھی ایرانی ملائیت کی وسیع بدعنوانی اور لوٹ مار، مذہبی جبر پر مبنی پالیسیوں، عوام کی معاشی بدحالی اور گھٹن کے حالات کے خلاف نئی نسل کی بے چینی جیسے عوامل نے تھیوکریٹک ریاست کو اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ دہائی کے دوران ایران میں کم از کم دس بڑی احتجاجی تحریکیں ابھر چکی ہیں جن کے مطالبات جمہوری و شہری آزادیوں، صنفی امتیاز و جبر کے خاتمے، طبقاتی مسائل کے حل اور معاشی حالات میں بہتری سے لے کے موجودہ ریاست کے یکسر خاتمے تک

مشرقِ وسطیٰ میں نیا کہرام

جاتے ہیں اور جنہیں انتہائی بے دردی سے کچلا گیا ہے۔ اسرائیل کے ساتھ جنگ لامحالہ طور پہ ایران کی پہلے سے نحیف اور پابندیوں سے دوچار معیشت کا مزید بیڑہ غرق کر دے گی۔ ایرانی ریاست کو اپنے اور اپنی پراکسیوں کے جنگی اخراجات میں کئی گنا اضافہ کرنا پڑے گا۔ جان و مال کا یہ بے نظیر ضیاع ایران کے داخلی بحران کو زیادہ شدت سے بھڑکانے کا موجب بن کے نئی عوامی بغاوتوں کو مشتعل کر سکتا ہے۔

تاریخی طور پر ایران کی پالیسی اپنی پراکسیوں کے ذریعے اسرائیل کے ساتھ ایک بالواسطہ، مبہم اور کم شدت پر مبنی طویل جنگ لڑنے کی رہی ہے جس میں دشمن کو تھکا کے

مجہول رکھا جائے یا بے بس کیا جائے۔ کیونکہ ایرانیوں کو اسرائیل کی بے انتہا معاشی، تکنیکی اور عسکری برتری کا پورا احساس ہے۔ جس کا مظاہرہ اسرائیلیوں نے حزب اللہ کے پیجروں میں دھماکوں سے لے کر اسماعیل ہانیہ اور حسن نصر اللہ کے قتل تک کیا ہے۔ مثلاً اسماعیل ہانیہ کو کس طرح قتل کیا گیا‘ اس بارے میں ابھی تک وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک ممکنہ صورت یہ ہے کہ تہران میں ان کی رہائش گاہ پر ایران کے اندر سے ہی میزائل داغا گیا۔ جبکہ ایک اور امکان یہ بھی ہے تہران میں جس جگہ انہوں نے رہائش اختیار کرنی تھی‘ وہاں کئی ہفتے یا مہینے پہلے ہی بم نصب کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈرون سے نشانہ بنائے جانے کی چہ مگوئیاں بھی ہیں۔ بہرصورت گھر آئے مہمان کا اس طرح سے قتل ایران کے لئے بڑی خجالت اور شرم کا باعث بنا ہے۔ جو ایرانی انٹیلی جنس کی بڑی ناکامی کے ساتھ ساتھ خود ایرانی ریاست میں موجود موساد کے وسیع و عریض نیٹ ورک کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

اسی طرح کا معاملہ حسن نصر اللہ کی ہلاکت کا ہے۔ جنہیں عین اسس وقت ایک زیر زمین بنکر میں نشانہ بنایا گیا جب وہ حزب اللہ کے دیگر رہنماؤں کے ساتھ ملاقات کر رہے تھے۔ تاکہ قیادت کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو قتل کیا جا سکے۔ کثیر منزلہ عمارت میں موجود نصر اللہ کا بنکر سطح زمین سے بھی 18 میٹر نیچے تھا جسے نشانہ بنانے کے لئے تقریباً ایک ہزار کلوگرام وزنی امریکی بنکر شکن بموں کا استعمال کیا گیا اور عمارتوں کے پورے بلاک کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ اسرائیل کی اس حکمت عملی کو ’ڈاہیا ڈاکٹرائن‘ کا نام دیا جاتا ہے جو بنیادی طور پر دشمن تنظیموں یا حکومتوں پر دباؤ بڑھانے کے لئے پورے پورے رہائشی علاقوں کو ملیا میٹ کر دینے پر مبنی ہے اور جس کا بے دریغ استعمال گزشتہ دو دہائیوں سے جاری ہے۔ غزہ پر حالیہ وحشت کے دوران اس نام نہاد ڈاکٹرائن کو نئی انتہاؤں پر لے جایا گیا ہے۔

بہرحال نصر اللہ کا قتل بھی حزب اللہ میں موجود اسرائیلی جاسوسوں سے حاصل کردہ معلومات کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ گزشتہ چند مہینوں میں ہونے والے یہ واقعات دشمن ممالک یا تنظیموں میں موساد کی گہری سرایت اور بے رحمی کی حد تک جانے کی خاصیت کو واضح کرتے ہیں۔ اس سے قبل بھی اسرائیل کی جانب سے ایران کے اندر اور باہر ایرانی ایٹمی سائنسدانوں اور اہم عسکری شخصیات کو قتل کرنے کی طویل تاریخ موجود ہے۔ اس عسکری تناظر میں اسرائیل کے ساتھ جنگ ایران کے لئے بڑی بربادی کا موجب بن سکتی ہے۔ جس میں سب سے پہلے امریکہ کے عطا کردہ جدید ترین جنگی جہازوں کے ذریعے ایرانی جوہری تنصیبات اور تیل کے انفراسٹرکچر وغیرہ کو تباہ کیا جائے گا۔ اسرائیل کے مقابلے میں ایران کی ایئر فورس عملاً ناپید ہے۔ ایسی افواہیں بھی ہیں کہ ایران‘ روس سے جدید ’سوخوئی 35‘ جہاز خریدنا چاہتا ہے۔ لیکن نہ صرف سیاسی و سفارتی بلکہ عسکری حوالے سے بھی یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران نے اسرائیل سے براہِ راست ٹکر لینے سے اجتناب برتنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ متحارب ترین سامراجی طاقتوں کے درمیان بھی کسی نہ کسی سطح پر انڈرسٹینڈنگ اور مفاہمت موجود ہوتی ہے جس کے تحت تمام تر مخالفت اور عداوت کے باوجود مخصوص حالات میں مشترکہ مفادات کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ ایران، اسرائیل اور امریکہ کے درمیان یہ جزوی یا وقتی مفاہمت ماضی میں کئی مواقع پر نظر آئی ہے۔ لیکن حالات پھر انہیں ایسی نہج پہ بھی لے جا سکتے ہیں جہاں تصادم اور خونریزی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا۔

مسئلہ یہ ہے کہ 7 اکتوبر کے واقعات کے بعد مذکورہ وجوہات کی بنا پہ اسرائیل نے ایران کو زچ کرنے اور اشتعال دلانے کی ہر حد کو عبور کیا ہے۔ ان حالات میں اپنے عوام، افواج اور علاقائی پراکسیوں کے سامنے ’فیس سیونگ‘ کے لئے جوابی کارروائی ایرانی ریاست کی مجبوری بن چکی تھی۔ اس سلسلے میں اسرائیل پر 13 اپریل اور پھر یکم اکتوبر کے میزائل حملے بنیادی طور پر علامتی اہمیت کے حامل تھے جن کا مقصد اسرائیل کو وارننگ دینا تھا۔ دونوں مرتبہ حملوں کے بعد ایران نے واضح کیا کہ وہ مزید تصادم نہیں چاہتا۔ تاہم 13 اپریل کی خاصی ’’دوستانہ‘‘ کارروائی (جس کی اطلاع بھی پیشگی دی گئی تھی اور نسبتاً بے ضرر ہتھیاروں کا استعمال کیا گیا تھا) کی نسبت یکم اکتوبر کا حملہ ایک زیادہ سخت اور سنجیدہ وارننگ کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کیفیت میں پھر ناگزیر طور پر ایران کی اپنی عسکری صلاحیتوں کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ معاشی و عسکری حوالے سے ایران‘ اسرائیل سے خاصا کمتر ملک ہے۔ لیکن اس باوجود یہ علاقائی پیمانے کی ایک بڑی سامراجی طاقت ہے جس کے پاس بنیادی صنعتی انفراسٹرکچر، خود انحصاری پر مبنی دفاعی تحقیق اور پیداوار کا نظام (جس میں یہ جدید ڈرون اور میزائل بھی تیار کر رہا ہے اور حالیہ عرصے میں روس کو بیچ بھی رہا ہے)، تیل کے وسیع ذخائر، بالائی درمیانے درجے کی آمدن والی معیشت اور مقداری حوالے سے خاصی بڑی جبکہ معیاری حوالے سے درمیانے درجے کی فوج موجود ہے۔ مثلاً آسانی کے لئے معاشی حوالے سے ہی موازنہ کریں تو ایران کا فی کس جی ڈی پی پاکستان سے تین گنا ہے!

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ایران نے اسرائیل کے وجود کے حق کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ ایرانی ملاں ریاست نے اپنے وجود کا جواز ہی ہمیشہ امریکہ و اسرائیل دشمنی کے ذریعے پیش کیا ہے۔ جنہیں وہ شیطانی قوتیں قرار دیتا ہے اور مسلمان دنیا میں خود کو ان کے خلاف مزاحمت کے علمبردار کے طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس حوالے سے اسرائیل کیساتھ براہِ راست جنگ میں نہ جانے کی تمام تر کوشش کے باوجود ایران نے طویل عرصے سے ایسی ممکنہ صورتحال کی تیاری کم از کم جاری رکھی ہے۔ فضائی جنگ اور ایئر ڈیفنس وغیرہ میں اسرائیل کی غیر متنازعہ برتری کے باوجود ایران نے ایسے جنگی شعبوں میں ترقی جاری رکھی ہے جن کے ذریعے وہ اپنی مذکورہ بالا

کمزوریوں کا ازالہ کر سکے۔ اس حوالے سے اسرائیل پر حالیہ فضائی حملہ خاصی اہمیت کا حامل تھا۔ جس میں ایران نے پہلی بار اپنے ’ہائپر سانک‘ میزائلوں (’’فتح‘‘) کا استعمال کر کے ایک واضح پیغام دیا ہے۔ یہ میزائل مبینہ طور پر آواز کی رفتار سے پانچ سے پندرہ گنا تیزی سے اپنے اہداف کو ڈیڑھ ہزار کلومیٹر دور تک نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور انہیں ہوا میں تباہ کرنا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی محال ضرور ہے۔ مزید برآں حملے کے لئے دانستہ طور پر رات کا وقت منتخب کیا گیا تا کہ پوری دنیا کو یہ میزائل اسرائیل کے زیر قبضہ علاقوں (یروشلم، تل ابیب وغیرہ) کو نشانہ بناتے ہوئے نظر آئیں۔ ایران کا دعویٰ ہے کہ اس نے اسرائیل کے فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بنایا اور 90 فیصد میزائل اسرائیل کے مشہورِ زمانہ ’آئرن ڈوم‘ اور دوسرے ایئر ڈیفنس کے نظاموں کو چیرتے ہوئے اپنے اہداف کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ اگرچہ پراپیگنڈہ کے مقاصد کے تحت کی جانے والی مبالغہ آرائی ہے لیکن پھر 99 فیصد میزائلوں کو راستے میں ہی تباہ کرنے کے امریکی و اسرائیلی دعوے اس سے بھی بڑی مبالغہ آرائی پر مبنی ہیں۔ کیونکہ حملے کی ویڈیو فوٹیجز میں سینکڑوں نہیں تو درجنوں میزائلوں کو اسرائیلی علاقوں پر گرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ بعد ازاں خود اسرائیلی میڈیا میں ایسی رپورٹیں سامنے آئی ہیں کہ ’نیواتم‘ ایئر بیس سمیت اسرائیلی فضائیہ کے ٹھکانوں کو نقصان پہنچا ہے۔ جبکہ ایک میزائل تل ابیب میں موساد کے ہیڈ کوارٹر کے بالکل قریب بھی گرا ہے۔

اگرچہ پہلے کی طرح اس بار بھی ایران کی کوشش تھی کہ اپنا پیغام کم سے کم نقصان کے ساتھ پہنچایا جائے تا کہ کسی بڑی جوابی کاروائی سے بچا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے عین ممکن ہے کہ ایرانی میزائلوں میں ایسے وار ہیڈز کا استعمال کیا گیا ہو جو بڑی تباہی کا موجب نہیں بنتے۔ لیکن یہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ اپنے عسکری نقصانات کی خبروں کو سختی سے دبانا اسرائیل کی پرانی پالیسی ہے اور اس حوالے سے سنسر شپ کا باقاعدہ نظام موجود ہے۔ بہرصورت اسرائیل کے امریکی و دیسی ایئر ڈیفنس سسٹم اتنے ناقابل تسخیر نہیں ہیں جتنے سمجھے جاتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر ایران خود یا اس کی پراکسیاں اسرائیل کے اندر تباہی پھیلانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

فضائی جنگ کے میدان میں اگرچہ ایرانی ایئر فورس کا اپنے اسرائیلی مد مقابل سے کوئی مقابلہ نہیں بنتا۔ موخر الذکر ایف 16 سے لے کر ایف 35 جیسے جدید ترین امریکی جہازوں سے لیس ہے۔ لیکن اس میدان میں بھی ایران کے پاس ایک توڑ یہ ہے کہ اس کے پاس زمین سے فضا میں مار کرنے والے نسبتاً جدید ہتھیار موجود ہیں۔ جس میں درجنوں قسم کے دیسی ساختہ میزائلوں سے لے کے ’S-300‘ جیسے جدید روسی میزائل سسٹم بھی شامل ہیں۔ جن کی موجودگی میں اسرائیلی جہازوں کے لئے ایرانی آسمانوں پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا آسان نہیں ہوگا۔ ایسے امکانات بھی ہیں کہ آنے والے دنوں میں روس کی ہچکچاہٹ کے باوجود ایران اس سے زمین سے فضا میں مار کرنے والے ’S-400‘ میزائل سسٹم حاصل کر لے۔ جو ’S-300‘ سے کہیں زیادہ جدید ہیں۔

لیکن ایران کا سب سے اہم جنگی اثاثہ پھر پورے خطے میں پھیلے اس کے پراکسی گروہ ہیں جن کے پاس وسیع افرادی قوت موجود ہے۔ صرف حزب اللہ کے جنگجوؤں کی تعداد کا اندازہ 40 ہزار تک جاتا ہے۔ مزید برآں یہ گزشتہ طویل عرصے سے یمن، عراق، شام، لبنان وغیرہ میں انتہائی خونریز اور پیچیدہ جنگوں میں لڑنے کا تجربہ اور تربیت رکھتے ہیں اور ان کے خصوصی یونٹس خاصے جدید اسلحے سے لیس بھی ہیں۔ اس حوالے سے کوئی بڑی جنگ، جو آخر کار زمین پر ہی لڑی جائے گی، اسرائیل کے لئے بھی خاصی پریشان کن‘ بلکہ تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔

ان چند ایک حقائق کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایران پر براہ راست چڑھائی اسرائیلیوں کے لئے سالگرہ کا کیک کاٹنے جیسی نہیں ہوگی۔ اسرائیلی اگر یہ حساب لگا کے بیٹھے ہیں کہ بیرونی حملے کی صورت میں بحران زدہ ایرانی ریاست کے اندر تیزی سے ٹوٹ پھوٹ جنم لے گی تو ان کی اپنی داخلی حالت بھی کوئی زیادہ مستحکم نہیں ہے۔ نہ ہی اسرائیلی فوج کے حوصلے بہت بلند ہیں۔ بہرحال جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ کوئی خوش کن تناظر بھی یقیناً نہیں ہے اور ایسے خوفناک نتائج کا حامل ہو سکتا ہے جن کی اندازہ لگانا بھی ابھی محال ہے۔ ایسے حالات ایران کو اپنا ایٹمی پروگرام تیز کرنے اور محض ایٹم بم ’بنانے‘ کی دھمکیاں دینے سے آگے بڑھنے پر بھی مجبور کر سکتے ہیں۔ کچھ اندازوں کے مطابق ایران چاہے تو ایک سال کے اندر اندر جوہری ہتھیار تیار کر سکتا ہے۔

موجودہ صورتحال اور آگے کے امکانات

پہلے غزہ اور اب لبنان میں حالیہ اسرائیلی جارحیت کو اگر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو اسے ایک بلند تر پیمانے پر ’نکبہ‘ کا تسلسل قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ گزشتہ ایک سال کے دوران اتنی بربادی اور خونریزی کے باوجود آج کا اسرائیل 7 اکتوبر 2023ء کی نسبت کہیں زیادہ غیر محفوظ اور غیر مستحکم ہے۔ نہ حماس کو کچلا جا سکا ہے‘ نہ غزہ میں موجود اسرائیلی یرغمالیوں کی رہائی ممکن ہو سکی ہے۔ الٹا کئی حوالوں سے فلسطینیوں میں حماس کی حمایت میں اضافہ ہوا ہے۔ کچھ مہینے قبل ’رائٹرز‘ کی جانب سے رپورٹ کی جانے والی ایک رائے شماری کے مطابق فلسطینیوں میں مسلح جدوجہد کی حمایت 8 فیصد اضافے کے ساتھ 54 فیصد جبکہ حماس کی حمایت 6 فیصد اضافے کے ساتھ 40 فیصد تک جا پہنچی ہے۔ دو تہائی لوگوں کا خیال تھا 7 اکتوبر کے حملے کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ جبکہ صرف 20 فیصد فلسطینی محمود عباس کو سپورٹ کرتے ہیں۔ تقریباً اسی عرصے میں کی جانے والی کچھ دوسرے رائے شماریوں کے مطابق حماس کی حمایت اس سے کہیں زیادہ ہے۔

اسی طرح خود امریکی میڈیا کی رپورٹوں کے مطابق حماس کی سرنگوں کا زیادہ تر نیٹ ورک (65 سے 80 فیصد تک) بدستور قائم ہے جبکہ اس کے ایک تہائی جنگجوؤں کا ہی خاتمہ کیا جا سکا ہے۔ حماس کے اپنے ذرائع کے مطابق اس کے صرف 20 فیصد جنگجو ہلاک ہوئے ہیں۔ جبکہ جنگ کے دوران بھی حماس بڑے پیمانے پر ریکروٹمنٹ کر رہی ہے۔ یکم اکتوبر کو جس وقت ایرانی میزائل اسرائیل پر منڈلا رہے تھے‘ تل ابیب میں حماس کی ایک کاروائی بھی جاری تھی۔ جس میں تنظیم کے دو مسلح جنگجوؤں نے گولیوں اور چاقو چھریوں کے ذریعے سات اسرائیلی شہریوں کو ہلاک اور 17 کو زخمی کیا۔ اسی طرح غزہ کے اندر بھی اسرائیلی سپاہیوں اور ٹینکوں وغیرہ پر حملوں کی اطلاعات اور پراپیگنڈہ ویڈیوز منظر عام پر آتی رہی ہیں۔

اسی قسم کی صورتحال حزب اللہ کی بھی ہے۔ جسے پیجر دھماکوں اور اعلیٰ قیادت کے بیشتر لوگوں کے قتل کے ذریعے ایک شدید وقتی دھچکا ضرور پہنچایا گیا ہے۔ لیکن اس کی اسرائیل کے خلاف لڑنے کی صلاحیت بدستور قائم ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ حزب اللہ‘ حماس نہیں ہے۔ جس کا اظہار جنوبی لبنان میں داخل ہونے والی اسرائیلی افواج کے خلاف شدید مزاحمت کی صورت میں بھی ہوا ہے۔ کچھ گھنٹے پہلے تک کی اطلاعات کے مطابق لبنان میں آٹھ اسرائیلی فوجی اب تک ہلاک ہو چکے ہیں جبکہ حزب اللہ کی جانب سے جنوبی لبنان اور اسرائیل کے اندر مزید حملوں کے دعوے سامنے آ رہے ہیں۔ یہ بنیادی طور پر لبنان کے اندر زمینی لڑائی کا پہلا دن تھا!

تاریخ واضح کرتی ہے کہ محض عسکری طریقوں سے حماس یا حزب اللہ جیسی تنظیموں کو کچلنا کم و بیش ناممکن ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسے حالات میں جب انہیں مقامی آبادیوں کی جزوی حمایت بھی حاصل ہو۔ مزید برآں یہ محض تنظیمیں نہیں ہیں بلکہ اپنی رجعتی یا مذہبی آؤٹ لک کے باوجود اسرائیل کی قبضہ گیری اور مغربی سامراج کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کے ساتھ جڑے رجحانات ہیں۔ جن کے تنظیمی ڈھانچوں کو توڑ بھی دیا جاتا ہے تو یہ نئی شکل میں سامنے آ جائیں گے یا ان کی جگہ زیادہ جارحانہ تنظیمیں لے لیں گی۔

موجودہ واقعات کو 2006ء کی لبنان اسرائیل جنگ

کے پس منظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جس میں اسرائیل کو خاصی ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس شکست سے اسرائیلی افواج نے بہت سے اسباق حاصل کیے تھے لیکن پھر ایسی ہی تیاری حزب اللہ بھی سالہا سال سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ جس کے جنگجو اپنے علاقوں کے چپے چپے سے واقف اور مشکل زمینی حالات میں لڑنے کے ماہر ہیں۔ یوں 'ڈاہیا ڈاکٹرائن' کے تحت فضا سے اندھا دھند بارود برسانا خاصا آسان کام ہے۔ لیکن زمینی جنگ ایک بالکل مختلف معاملہ بن کے رہ جاتی ہے۔

یہ سوال بھی اہم ہے کہ ایران کے حالیہ حملے کا جواب اسرائیل کس طرح دے سکتا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ مساوات ہے جس میں بین الاقوامی دباؤ اور سفارت و مصالحت کی کوششوں کا بھی اہم کردار ہوگا۔ اسرائیل ایران کے اندر بھی کاروائی کرنے کی طرف جا سکتا ہے (جس کے امکانات کا جائزہ اوپر لیا گیا ہے) اور ایران سے باہر ایرانی اثاثوں یا پراکسیوں کے خلاف کسی غیر متوقع کاروائی کی صورت میں بھی جواب دے سکتا ہے۔ لیکن ہر دو صورتوں میں جوابی کاروائی کی نوعیت اور شدت ایران کے ردعمل اور آگے کے واقعات کا تعین کرے گی۔

اپریل میں ایران کے علامتی حملے کے جواب میں اسرائیل نے فیس سیونگ کے لئے اصفہان (ایران) پر ایک واجبی سا میزائل حملہ کیا تھا۔ جب کہ شام اور عراق میں بھی ایرانی اتحادیوں کے ٹھکانوں کو ہلکے پھلکے انداز سے نشانہ بنایا تھا۔ جس کے بعد معاملہ کم از کم وقتی طور پہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ تاہم اب کی بار صورتحال مختلف ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسرائیل کوئی اعلانیہ یا معمول سے مختلف کاروائی کرنے کی بجائے یمن، لبنان اور شام وغیرہ میں ایرانی پراکسیوں پر حملوں میں اس قدر شدت اور وسعت لے آئے کہ ایران کو لامحالہ پھر کوئی ردعمل دینا پڑے۔

ان سطور کی تحریر کے وقت قطر میں ایران اور خلیجی ریاستوں کے اعلیٰ حکام کے اجلاس کی خبریں بھی گردش میں ہیں۔ جس میں یقیناً صورتحال کو مزید بگڑنے سے روکنے کی راہ نکالنے کی کوشش کی جائے گی۔ قطر کے ذریعے ایران کے امریکہ کے ساتھ مذاکرات کی اطلاعات بھی ہیں جن میں ایرانیوں نے واضح کیا ہے کہ ''یکطرفہ صبر وتحمل کا مرحلہ گزر چکا ہے۔'' لیکن شاید اس سے بھی اہم خبر یہ ہے خلیجی ریاستوں نے ایران کو اپنی غیر جانبداری کا یقین دلایا ہے۔ کیونکہ کسی بڑے تصادم کی صورت میں انہیں اپنی تیل کی تنصیبات برباد ہو جانے کا خوف بھی لاحق ہے۔ گزشتہ کچھ دہائیوں میں نہ صرف مشرق وسطیٰ بلکہ عالمی سطح کے پیچیدہ تنازعات میں بھی قطر کا 'مصالحانہ' اور ثالثی پر مبنی کردار اور اثر و رسوخ ایک دلچسپ مظہر ہے۔ جو ظاہر ہے الگ سے ایک تفصیلی تجزیئے کا متقاضی ہے۔

ایران نے مزاحمت کے عندیے کے طور پر اپنے وزیر خارجہ کو بھی لبنان بھیجا ہے۔ اسی طرح 4 اکتوبر کو پانچ سال میں پہلی بار آیت اللہ خامنائی نے رائفل اپنے ساتھ رکھ کر جمعے کے خطبے میں دسیوں ہزار لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے اسرائیل کو ایک خبیث ریاست قرار دیا جو امریکی مدد کے بغیر ''زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی۔'' انہوں نے مزید واضح کیا کہ خطے میں (ایرانی) مزاحمت پیچھے نہیں ہٹے گی اور ابھی اسرائیل کو بہت کم سزا دی گئی ہے۔

لیکن کوئی غیر معمولی صورتحال پھر روس کو بھی مشرق وسطیٰ میں اپنی 'سافٹ پاور' سفارت کاری کی جگہ زیادہ واضح اور یکطرفہ پوزیشن لینے پر مجبور کر سکتی ہے۔ روس کے اس وقت حماس، الفتح اور اسلامک جہاد جیسے فلسطینی گروہوں کیساتھ بھی مراسم ہیں جبکہ اسرائیل کے ساتھ بھی اس کے تعلقات اس حد تک استوار ہیں کہ شام میں وہ روسی ٹھکانوں یا املاک کو نشانہ بنانے سے اجتناب برتتا ہے۔ اسرائیل نے بھی یوکرائن کے معاملے میں نسبتاً لاتعلقی یا غیر جانبداری کا رویہ اپنایا ہے۔ اس سے ہٹ کے بھی روس اور اسرائیل کے درمیان کئی معاشی و سیکورٹی معاملات میں معاونت موجود ہے۔ دوسری طرف ایران کیساتھ بھی اس کے گہرے سفارتی و عسکری مراسم موجود ہیں۔ عراق، شام، افغانستان اور وسط ایشیا کے ممالک میں دونوں ایک دوسرے کے پارٹنر ہیں اور جدید ملٹری ہارڈ ویئر کا تبادلہ بھی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں روس تیل اور گیس وغیرہ کی صورت میں یورپ کو توانائی کا بڑا فروخت کنندہ ہے اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے ساتھ بھی توانائی اور دوسرے شعبوں میں تجارت و سرمایہ کاری کرتا ہے۔ ایران اور اسرائیل کے درمیان براہ راست جنگ روس کے لئے کڑا امتحان ثابت ہوگی۔ لیکن شاید اس سے بھی مشکل صورتحال چین کی ہے جس کا روس سے بھی بڑا کاروبار ہر کسی کے ساتھ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قوتیں ابھی تک کھل کے کسی جانبداری کا مظاہرہ کرنے سے اجتناب برت رہی ہیں اور ایک توازن قائم رکھنے کی کٹھن جدوجہد میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ توازن خاصا نازک ہے جسے غیر معمولی واقعات بگاڑ بھی سکتے ہیں۔

حالات ہر لمحہ بدل رہے ہیں اور واقعات بہت تیزی سے جنم لے رہے ہیں۔ یہ صورتحال اس بنیادی مارکسی تھیسس کو ایک بار پھر درست ثابت کرتی ہے کہ آج سامراجی سرمایہ داری کے پاس انسانیت کو دینے کے لئے محرومی، ذلت اور جنگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس نظام میں سرمائے کے مفادات ہی مقدم ہیں اور پیسے کے رشتے ہی ہر تعلق اور ناطے پر حاوی ہیں۔ یہ آخری تجزیئے میں منافع خوری اور سرمائے کے اجتماع کی ہوس ہی ہے جو مشرق وسطیٰ سمیت دنیا کے بیشتر حصوں کو تاراج کرتی جاتی ہے۔ پچھلے ایک سال میں وہ کون سا جبر اور کون سی بربریت ہے جسے غزہ میں روا نہیں رکھا گیا ہے۔ اس نسل کشی کے تماشائیوں اور سہولت کاروں میں سیکولرازم، جمہوریت اور انسانی حقوق کے مغربی علمبرداروں سے لے کے ترکی، سعودی عرب اور پاکستان میں مذہب اور 'امت' کی سیاست کرنے والوں تک' سب شامل ہیں۔

7 اکتوبر کے حملے نے صورتحال کو یکسر بدل دیا ورنہ ''ابراہم اکارڈز'' کے تحت یہ عرب حکمران اسرائیل کے ساتھ دوستی اور محبت کی پینگیں بڑھانے میں ہر حد تک جانے کو تیار تھے۔ جس میں شاید پاکستان میں ان کٹھ پتلیاں بھی پیچھے نہ رہتیں۔

یہ دوسری عالمی جنگ کے بعد کے اس لبرل آرڈر کا مکروہ چہرہ ہے جسے سوویت یونین کے انہدام کے بعد انسانیت کو ترقی، استحکام اور خوشحالی کے بامِ عروج تک پہنچانا تھا۔ دنیا آج ماضی کے کسی دور سے کہیں زیادہ عدم استحکام، انتشار اور خونریزی سے دوچار ہے۔ یہ استحصال، جبر اور انسان دشمنی پر مبنی ایک تاریخی طور پر متروک سماجی نظام کے ناگزیر مضمرات ہیں۔ جو ہر گزرتے دن کے ساتھ نسل انسان کو بربریت کی طرف دھکیلتا جاتا ہے۔

اسرائیل کا وجود مشرق وسطیٰ کے جسم پر کسی کینسر سے کم نہیں ہے۔ اسے قائم ہی خطے پر سامراجی دھونس اور بدمعاشی کو مسلسل مسلط رکھنے کے لئے کیا گیا تھا۔ آج تمام عرب حکمران اور ان کی ریاستیں اس سامراجی پراجیکٹ کی حصہ دار اور سہولت کار ہیں۔ اس دنیا کے مظلوم اور محکوم عوام کے سوا فلسطینیوں کا کوئی ہمدرد، کوئی دوست نہیں ہے۔ ایرانی ملاں ریاست بذات خود ایک انتہائی جابر اور رجعتی اکائی ہے جس کا کردار اپنے ملک کے اندر اور باہر محنت کش عوام کی تحریکوں کو کچلنے پر مبنی رہا ہے اور جو آخری تجزیئے میں اسی سامراجی نظام کے دوام کا ہی اوزار ہے۔ یہی کردار چین اور روس کی ریاستوں کا بھی ہے۔ لیکن حالیہ بحران اور انتشار بالفرض تھم جاتا ہے تو بھی جب تک اسرائیل کی صیہونی ریاست کا وجود باقی ہے' مشرق وسطیٰ میں کوئی دور رس امن و استحکام قائم نہیں ہو سکتا۔ اسرائیلی ریاست کو یکسر تحلیل کرنے کے پروگرام کے بغیر مشرق وسطیٰ کی سوشلسٹ فیڈریشن کا نعرہ بھی ایک فریب اور حماقت بن کے رہ جاتا ہے۔ لیکن پھر صیہونی ریاست کو اکھاڑ پھینکنے کا فریضہ پورے مشرق وسطیٰ میں سرمایہ دارانہ ریاستوں کے دھڑن تختے اور سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کیساتھ مشروط ہے۔ جو خطے کے محنت کش عوام کی طبقاتی بغاوتوں کو مسلسل سوشلسٹ انقلاب کے پروگرام اور لائحہ عمل کیساتھ مربوط کرنے سے ہی ممکن ہے۔

سری لنکا: ڈسانائیکے کی آزمائش!

21 ستمبر کو ہونے والے صدارتی انتخابات میں بائیں بازو کے نیشنل پیپلز پاور اتحاد کے مشترکہ امیدوار ڈسانائیکے نے سب سے زیادہ ووٹ (42 فیصد) حاصل کر کے ملک کا صدر منتخب ہوئے۔

تحریر: راہول

سنگین سیاسی واقتصادی بحران میں دوسال گزارنے کے بعد سری لنکا کے عوام نے صدارتی انتخابات میں ”بائیں بازو“ کی طرف جھکاؤ رکھنے والے سیاست دان اور جناتھا وکمتی پیرامونا (جے وی پی) کے رہنما انورا کمار ڈسانائیکے (اے کے ڈی) کو ملک کا صدر منتخب کیا ہے۔ 21 ستمبر کو ہونے والے صدارتی انتخابات میں بائیں بازو کے نیشنل پیپلز پاور اتحاد کے مشترکہ امیدوار ڈسانائیکے نے سب سے زیادہ ووٹ (42 فیصد) حاصل کر کے اپوزیشن رہنما سجیت پریماداسا کو شکست دی جبکہ سابق صدر رانیل وکرماسنگھے مجموعی طور پر تیسرے نمبر پر رہے۔

ڈسانائیکے کی اس فتح کو سری لنکا کے سیاسی منظر نامے میں ایک بڑی تبدیلی کی علامت سمجھا جا سکتا ہے۔ یقیناً یہ نتیجہ ایک ایسی شخصیت کے حوالے سے نہایت حیران کن ہے جس نے 2019ء کے انتخابات میں محض تین فیصد ووٹ لیے ہوں اور صرف پانچ سال بعد ملک کا صدر منتخب ہو جائے۔ مگر ڈسانائیکے کی یہ کامیابی جہاں سری لنکا کے عوام کی جانب سے روایتی سیاسی جماعتوں کے واضح استرداد کی نشاندہی کرتی ہے وہیں خود ڈسانائیکے کے لیے ان انتخابات کا نتیجہ اقتصادی دباؤ اور بدلتے ہوئے عالمی حالات میں ایک سنگین چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔

2022ء میں سری لنکا کو اپنی تاریخ کے بدترین اقتصادی بحران کا سامنا تھا جس کے نتیجے میں عوام نے سڑکوں پر نکل کر سابق صدر گوتابایا راجاپاکسے کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ اگرچہ اُس وقت کی پارلیمنٹ، جو کہ راجاپاکسے کے حامیوں پر مشتمل تھی، نے رانیل وکرماسنگھے کو صدر منتخب کیا جس نے آئی ایم ایف کی ایما پر بیل آؤٹ پیکیج کے عوض عوام پر بدترین معاشی حملے جاری رکھے۔ ایسے میں یہ ناگزیر تھا کہ حالیہ انتخابات میں عوام ان تمام پرانی جماعتوں اور سیاسی خاندانوں کو مکمل طور پر مسترد کر دیں جو دہائیوں سے ملک کو تباہی کی طرف دھکیل رہے تھے۔

ڈسانائیکے کی کامیابی کی بنیادی وجہ مروجہ سیاست کی کرپشن، بدنامی اور عوام کو درپیش معاشی مسائل ہیں۔ وہ خود بھی معاشی دیوالیے کے موجودہ حالات، جن میں بھوک، غربت اور بیروزگاری میں ہوشربا اضافہ ہوا ہے، کی سنگینی سے اچھی طرح واقف ہے۔ لیکن جہاں تمام عالمی میڈیا اسے ”مارکسی“ یا ریڈیکل بائیں بازو کے نظریات کی طرف جھکاؤ رکھنے والے سیاست دان کے طور پر متعارف کروا رہا ہے وہیں موصوف خود کو ایک اصلاح پسند اور لبرل ڈیموکریٹ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس کا پروگرام اقتصادی بہتری کو اپنی ترجیح بنانا، حکومت کی بدعنوانی کو ختم کرنا، شفافیت کو فروغ دینا اور آئی ایم ایف سے دوبارہ مذاکرات کرنا وغیرہ ہے۔ موجودہ حالات میں یہ بالکل غیر حقیقی اور غیر عملی باتیں بن کے رہ جاتی ہیں۔

اگر ماضی میں دیکھا جائے تو جے وی پی خود کو ایک ’مارکسسٹ لیننسٹ‘ پارٹی کہتی تھی۔ اگرچہ اس وقت بھی اس کی پالیسیوں پر سنہالی قوم پرستی اور طبقاتی مصالحت کی چھاپ واضح تھی۔ لیکن ریاست کے خلاف مسلح بغاوتیں کرنے پر اس کے کارکنوں کو بڑے پیمانے پر قتل کرنے سمیت قید اور جلاوطن بھی کیا گیا۔ مگر آج اس جماعت کا عملی پروگرام نہ صرف سوشل ڈیموکریسی کی حدود میں مقید ہے بلکہ اس نے اپنے انقلابی ماضی سے کافی حد تک کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔

ڈسانائیکے نے اپنی انتخابی مہم میں بدعنوانی کے خاتمے اور آئی ایم ایف کے ساتھ موجودہ معاہدے کو دوبارہ مذاکرات کے ذریعے بہتر کرنے کے وعدے تو کیے ہیں۔ لیکن ایسی مبہم معاشی پالیسیاں اس کے اقتدار کے لیے شدید مشکلات پیدا کر سکتی ہیں۔ اکانومسٹ کے مطابق ”ڈسانائیکے

کا اقتدار ایک نازک کیفیت میں کھڑا ہے۔ جہاں اس کے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ایک مشکل وقت ہے اور سری لنکا کو مستقبل کے لیے کسی معجزے کی ضرورت ہے۔''

جے وی پی کا ماضی کافی تلخیوں سے دوچار رہا ہے۔ یہ جماعت ماضی میں اقلیتی گروہوں' خصوصاً تاملوں اور مسلمانوں کے حوالے سے متنازعہ رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ حالیہ انتخابات میں بھی ان علاقوں میں جے وی پی کی حمایت کمزور رہی جہاں تامل اور مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اس جماعت کو ماضی میں سنہالی قوم پرست جماعت سمجھا جاتا تھا اور اقلیتیں اب بھی جے وی پی پر مکمل اعتماد کرتے دکھائی نہیں دیتیں۔ ان آبادیوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ہی اس نے اپنے انتخابی منشور میں مختلف نسلی اور مذہبی گروہوں کے درمیان اتحاد کا وعدہ کیا ہے۔

آنے والے عرصے میں صدر ڈسانائیکے کو نہ صرف سنگین معاشی چیلنجوں کا سامنا رہے گا بلکہ ایک ممکنہ سیاسی بحران بھی اس کا منتظر ہے۔ موجودہ پارلیمنٹ، جسے 24 ستمبر کو تحلیل کر دیا گیا تھا، میں ڈسانائیکے کی جماعت کو اکثریت حاصل نہیں تھی۔ ایسے میں جے وی پی کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ نومبر میں ہونے والے پارلیمانی انتخابات میں بھی کامیابی حاصل کرے۔ اگر جے وی پی ان انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے تو انہیں حکومت بنانے اور قانون سازی وغیرہ کے لیے سیاسی اتحادی تلاش کرنے ہوں گے اور اس کے لیے شاید دوبارہ انہی پرانی جماعتوں کے ساتھ اتحاد اور مفاہمت کرنی پڑے جن کے خلاف وہ اپنی پوری انتخابی مہم چلاتے رہے ہیں۔ ایسے میں سری لنکا کے عوام، جو معاشی مشکلات سے پہلے ہی بدحال ہیں، جلد نئے صدر سے بھی مایوس ہونے کی طرف جائیں گے۔

ڈسانائیکے کی کامیابی نہ صرف سری لنکا کی داخلی سیاست بلکہ بین الاقوامی تعلقات کے تناظر میں بھی اہمیت رکھتی ہے۔ سری لنکا کے جغرافیائی محل وقوع اور تذویراتی (Strategic) اہمیت نے بھارت اور چین دونوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے (جبکہ پاکستان کی مداخلت بھی موجود رہی ہے)۔ بحر ہند میں واقع ہونے کی وجہ سے سری لنکا عالمی تجارتی راستوں کے بیچ شمار کیا جاتا ہے۔ جس کے باعث یہ خطہ بھارت اور چین کے لیے نہ صرف اقتصادی بلکہ جغرافیائی لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ بھارت کی سری لنکا میں دلچسپی کئی پہلوؤں پر مبنی ہے۔ سب سے پہلے تو سری لنکا' بھارت کے جنوبی ساحل کے قریب واقع ہے اور دونوں ممالک کے درمیان تاریخی ثقافتی اور مذہبی تعلقات بھی رہے ہیں۔ اگرچہ تاملوں کی مسلح بغاوت کو لے کے دونوں ممالک کے سرکاری تعلقات میں تضادات اور تلخیاں بھی آئیں۔

حالیہ عرصے میں بھارت' سری لنکا میں چین کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے محتاط نظر آتا ہے اور وہاں اپنا اقتصادی اور سیاسی اثر برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرا بھارت نے سری لنکا کے مختلف ترقیاتی منصوبوں میں سرمایہ کاری کی ہے۔ خاص طور پر شمالی سری لنکا میں جہاں تامل نسل کے لوگوں کی اکثریت ہے۔ تامل اقلیت کے حقوق کا مسئلہ بھارت کے لیے اہم رہا ہے کیونکہ بھارت میں تامل ناڈو کی ریاست کے لوگ سری لنکا کے تاملوں کے ساتھ نسلی اور ثقافتی جڑت رکھتے ہیں۔ بھارت نے سری لنکا کو 2022ء میں بڑے پیمانے پر اقتصادی امداد بھی فراہم کی تھی اور وہاں کے اہم بندرگاہی منصوبوں میں بھی بھارتی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے تاکہ چین کے بڑھتے ہوئے اثر کا مقابلہ کیا جا سکے۔ جے وی پی کو تاریخی طور پر بھارت مخالف سمجھا جاتا رہا ہے۔ تاہم اپنے مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی نے ڈسانائیکے کو انتخابی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہوئے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کو مزید مضبوط کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ بھارت اور سری لنکا کے درمیان نزدیکیاں چین کے لیے ناخوشگواری یا مشکلات کا باعث بن سکتی ہیں۔

چین کی سری لنکا میں دلچسپی ''بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے'' کا اہم پہلو ہے۔ جس کے تحت چین بحر ہند میں اپنے تجارتی راستوں کو محفوظ بنانا چاہتا ہے۔ چین نے سری لنکا میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی ہے۔ اس سلسلے میں ہمبنٹوٹا بندرگاہ کی تعمیر اور کولمبو میں اربن ترقیاتی منصوبے اہم ہیں۔ ہمبنٹوٹا بندرگاہ کو چین کے لیے اہم تذویراتی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے جو کہ بحر ہند میں چین کی موجودگی کو تقویت دیتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ چین' سری لنکا کو بنیادی انفراسٹرکچر کی ترقی کے لیے قرضے بھی فراہم کرتا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے سری لنکا پر چینی قرضوں کا بوجھ بڑھا ہے۔ جس پر پھر بھارت اور مغربی ممالک کی جانب سے خدشات ظاہر کیے گئے کہ سری لنکا' چینی قرضوں کے جال میں پھنستا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ مزید چین کے سیاسی اور اقتصادی دائرہ اثر میں آ سکتا ہے (اگرچہ سری لنکا پر مغرب سمیت دوسرے ممالک کے قرضوں کا بوجھ چین سے کہیں زیادہ ہے)۔ اس تناظر میں سری لنکا' بھارت اور چین دونوں کے لیے ایک اہم میدانِ جنگ بن چکا ہے جہاں دونوں ممالک اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے کوشاں ہیں۔ صدر ڈسانائیکے کے لیے یہ بھی اہم چیلنج ہو گا کہ وہ بھارت اور چین جیسی سامراجی قوتوں کے درمیان کیسے توازن برقرار رکھتا ہے۔ خاص طور پر ان منصوبوں کے حوالے سے جو دونوں ممالک کے معاشی وتذویراتی مفادات سے جڑے ہوئے ہیں۔

عالمی سرمایہ داری آج گہرے بحران کا شکار ہے۔ دنیا کا کوئی بھی خطہ ہو' اس نظام کی متروکیت ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنا اظہار کر رہی ہے۔ بحران کی سنگینی جیسے جیسے بڑھ رہی ہے' محنت کش عوام پر معاشی حملوں کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ جبکہ ان حملوں کے خلاف خود رو تحریکوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ بھی جاری ہے۔ سری لنکا کے حالیہ انتخابات میں عوام نے پرانے نظام کو مسترد کرنے کا واضح پیغام دیا ہے۔ کسی متبادل انقلابی قیادت کی عدم موجودگی میں عارضی طور پر ہی سہی لیکن عوام نے جے وی پی پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اب صدر ڈسانائیکے کا کڑا امتحان عوام کی توقعات پر پورا اترنا ہے۔ عوام کو یہ توقع ہے کہ معیشت کو بحال کیا جائے گا، ان کے حالاتِ زندگی میں بہتری آئے گی اور بدعنوانی کو ختم کیا جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ڈسانائیکے کو آئی ایم ایف اور دیگر عالمی قرض دہندگان کے ساتھ کیے گئے قرضوں کی ادائیگی کے معاہدوں پر بھی عمل درآمد کرنا ہو گا۔ آئی ایم ایف کیساتھ معاہدے پر نظر ثانی کی باتیں قابل عمل نہیں ہیں۔ بہترین صورتوں میں بھی بہت معمولی رعایات ہی مل سکیں گے۔ چنانچہ آئی ایم ایف کے پروگرام میں ہوتے ہوئے محنت کش عوام کی بہتری کے لیے اقدامات اٹھانے کی گنجائش کم و بیش ناپید ہو گی۔ چاہے کرپشن کو کنٹرول بھی کر لیا جائے۔ اگرچہ ہم سمجھتے ہیں کہ بحران زدہ سرمایہ داری میں رہتے ہوئے بدعنوانی کے خاتمے کی باتیں بھی سراب ہی ہیں۔

یوں پوری عالمی سرمایہ داری کے بحران کے حالات میں خاطر خواہ معاشی بحالی کے لیے سطحی قسم کی اصلاحات ناکافی ہو کے رہ جاتی ہیں۔ ڈسانائیکے نے اپنی وکٹری سپیچ میں سری لنکا کو آئی ایم ایف کے ساتھ ''شراکت داری'' میں آگے بڑھانے کی بات کی ہے۔ جو کمپرومائیز کا واضح اشارہ ہے۔ مارکسی نظریات سے انحراف کرنے والی اس قیادت کا طبقاتی جدوجہد، بیرونی قرضوں کی ضبطی، نیشنلائزیشن اور نجی ملکیت کے خاتمے جیسے انقلابی اقدامات سے کوئی لینا دینا نہیں۔ لیکن پھر ایسے اقدامات کے بغیر بہتری کی کوئی صورت بھی نہیں ہے۔ ماضی کے حکمرانوں کی طرح ڈسانائیکے کا اقتدار بھی عالمی قرضوں، مالیاتی اداروں اور سامراجی سرمایہ کاری کا مرہونِ منت ہی رہے گا۔ ان سامراجی اداروں اور قوتوں کے ایجنڈے میں عوامی فلاح جیسی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ ان کے لیے مقدم صرف منافعوں کا حصول ہے۔ یہ حالات 2022ء میں انقلابی سرکشی کی نہج تک چلے جانے والے محنت کش عوام' بالخصوص نوجوانوں کے سامنے نئے چیلنج اور نئے سوالات رکھیں گے۔ نہ صرف سری لنکا بلکہ دنیا بھر کے استحصال زدہ لوگوں کے سامنے اصلاح پسندی کی محدودیت اور متروکیت ایک بار پھر واضح ہو گی اور ناگزیر طور پر آگے کی جدوجہدوں کی سیاسی و نظریاتی سمت کے تعین میں اہم کردار ادا کرے گی۔

انقلابِ روس 1917ء اور آج کی دنیا

تحریر: لال خان

ڈاکٹر لال خان کا یہ آرٹیکل 7 نومبر 2017ء کو شائع کیا گیا تھا۔ اس سال انقلاب روس کی 107 ویں سالگرہ کے موقع پر قارئین کے لئے اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

1917ء کا انقلابِ روس انسانیت کی عظیم تاریخی جست تھی جس نے تاریخ کا دھارا ہمیشہ کے لئے موڑ دیا۔ اس کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ پورے کرۂ ارض پر حکمران طبقات کے تخت لرزنے لگے۔

سو سال پہلے روس میں بالشویک انقلاب برپا ہوا۔ انسانی سماج کے طبقات میں تقسیم ہونے کے بعد سے یہ محنت کشوں کی سب سے فیصلہ کن فتح تھی۔ اس سرکشی کے ذریعے بالشویکوں نے ایک اقلیتی طبقے کے اقتدار کے خلاف اکثریت کی قیادت کی اور سماج کی اکثریت کی حاکمیت کی بنیادیں استوار کیں۔ 1917ء کا انقلابِ روس انسانیت کی عظیم تاریخی جست تھی جس نے تاریخ کا دھارا ہمیشہ کے لئے موڑ دیا۔ اس کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ پورے کرۂ ارض پر حکمران طبقات کے تخت لرزنے لگے۔

امریکہ کا انقلابی صحافی جان ریڈ، جس نے انقلاب کے واقعات کا براہِ راست مشاہدہ کیا، اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'دنیا کو ہلا دینے والے دس دن' میں لکھتا ہے، ''کوئی بالشویزم کے بارے میں کچھ بھی سوچے، یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انقلابِ روس انسانیت کی تاریخ کے عظیم ترین واقعات میں سے ایک ہے اور بالشویکوں کا اقتدار عالمگیر اہمیت کا حامل ہے۔''

اس وقت زار شاہی روس میں نافذ پرانے کیلنڈر کے مطابق انقلابی سرکشی کا آغاز 25 اکتوبر (نئے کیلنڈر کے مطابق 7 نومبر) کی شام کو ہوا اور بالشویکوں کا اقتدار پر قبضہ 25 اور 26 اکتوبر کی درمیانی رات کو ہوا۔ اس انقلاب نے اقتدار کو ایک اقلیتی حاکم طبقے سے چھین کر اکثریتی محنت کش طبقے کے حوالے کیا۔ بالشویک پارٹی کے اقتدار پر قبضے کے عمل میں محنت کش طبقے کی اکثریت کی گہری شعوری مداخلت موجود تھی۔ یہ آج تک کا واحد انقلاب ہے جو کلاسیکی مارکسی سطور پر استوار ہوا۔

لینن نے اس حقیقی تبدیلی کی وضاحت کی جو انقلاب کو پیدا کرنا تھی۔ اس نے دسمبر 1917ء میں لکھا، ''آج کے اہم ترین فرائض میں یہ شامل ہے کہ محنت کشوں کی آزادانہ پیش قدمی کو پروان چڑھایا جائے۔ اسے ہر ممکن حد تک وسیع کر کے تخلیقی تنظیمی کام میں تبدیل کیا جائے۔ ہمیں ہر قیمت پر اس پرانے، فضول، وحشی اور قابل نفرت عقیدے کو پاش پاش کرنا ہو گا کہ صرف نام نہاد اعلیٰ طبقات، امرا اور امرا کی تعلیم و تربیت پانے والے ہی ریاست کا نظام چلا سکتے ہیں اور

سوشلسٹ سماج کو منظم کر سکتے ہیں۔''

بالشویک پارٹی کی سب سے ممتاز خاصیت یہ تھی کہ انہوں نے محنت کش عوام کے مفادات کی حفاظت کے موضوعی مقصد کو انقلاب کی حرکیات سے جوڑا۔ پارٹی کی حکمت عملی کی بنیاد ان قوانین کی سائنسی دریافت تھی جن کے تحت عوامی تحریکیں اور سماجی شورشیں اتار چڑھاؤ سے گزر کر آگے بڑھتی ہیں۔ جدوجہد میں محکوم اور استحصال زدہ عوام صرف اپنے مطالبات، امنگوں اور ضروریات سے ہی نہیں بلکہ اپنی زندگیوں کے تجربات سے بھی رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ عوام کے تجربے کی طرف بالشویکوں کا رویہ کبھی بھی تضحیک آمیز یا گھمنڈی نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ وہ اس تجربے کو اپنا نقطہ آغاز بنا کر آگے بڑھتے تھے۔ اصلاح پسند اور جعلی انقلابی مصائب اور رکاوٹوں کا رونا روتے تھے، جبکہ بالشویک مردانہ وار ان کا مقابلہ کرتے تھے۔ ٹراٹسکی اپنی تاریخ ساز تصنیف 'انقلاب روس کی تاریخ' میں لکھتا ہے: ''بالشویک صرف قول میں نہیں بلکہ فعل میں بھی، صرف ظاہریت میں نہیں بلکہ حقیقت میں بھی انقلابی تھے... بالشویزم نے ایک ایسا مستند انقلابی فرد تخلیق کیا جو اپنے ذاتی وجود، خیالات اور اخلاقی فیصلوں کو ایسے تاریخی مقاصد کے تابع کرتا ہے جو مروجہ سماج سے ناقابل مصالحت ہوتے ہیں۔ پارٹی میں بورژوا نظریات سے ضروری فاصلہ ایک چوکس عدم مصالحت کے ذریعے برقرار رکھا گیا تھا، جس کا روح رواں لینن تھا۔ لینن ایک نشتر کی طرح ان تمام بندھوں کو مسلسل کاٹتا رہتا تھا جو پیٹی بورژوا ماحول میں پارٹی اور سرکاری رائے عامہ کے درمیان استوار ہوتے تھے۔ عین اسی وقت لینن نے پارٹی کو ابھرتے ہوئے طبقے کے خیالات اور جذبات کی بنیاد پر اپنی رائے عامہ استوار کرنا بھی سکھایا۔ یوں انتخاب، تربیت اور مسلسل جدوجہد کے عمل سے بالشویک پارٹی نے نہ صرف اپنا سیاسی بلکہ اخلاقی ماحول بھی تخلیق کیا، جو بورژوا رائے عامہ سے آزاد اور بالکل برخلاف تھا۔ صرف اسی چیز نے بالشویکوں کو اپنی صفوں میں تذبذب پر قابو پانے اور عمل میں وہ عزم دکھانے کے قابل بنایا جس کے بغیر اکتوبر کی فتح ناممکن تھی۔'' فتح مند سرکشی کے بعد لینن نے 'سوویتوں کی کل روس کانگریس' سے خطاب کرتے ہوئے کہا، ''تاریخ کے کچرے کو صاف کرنے کے بعد اب ہم اس خالی جگہ پر سوشلسٹ سماج کی ہوادار اور عالیشان عمارت تعمیر کریں گے۔''

انقلاب نے سماجی و معاشی تبدیلی کے ایک نئے عہد کا آغاز کیا۔ وسیع و عریض جاگیروں، بھاری صنعت، کارپوریٹ اجارہ داریوں اور معیشت کے کلیدی شعبوں کو نومولود مزدور ریاست نے ضبط کر لیا۔ مالیاتی سرمائے کی آمریت کو توڑا گیا، تمام بیرونی تجارت پر ریاست نے اپنی اجارہ داری قائم کی۔ وزیروں اور عہدیداروں کی مراعات کا خاتمہ کیا گیا اور انقلاب کے رہنما بھی انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ وکٹر سرج اپنی 'ایک انقلابی کی یادداشتوں'

میں لکھتا ہے: ''کریملن میں لینن نوکروں کے لئے تعمیر کئے گئے چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔ موسم سرما کے دوران باقی سب کی طرح اس کے پاس بھی گھر کو گرم رکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ جب وہ نائی کے پاس جاتا تو اپنی باری کا انتظار کرتا اور کسی دوسرے کے پیچھے ہٹنے کو نامناسب خیال کرتا۔''

بالشویکوں کا جمہوری طرز عمل مسلمہ تھا۔ ابتدا میں نئی انقلابی حکومت کو بالشویکوں کے ساتھ ساتھ بائیں بازو کے سوشل انقلابیوں اور منشویک انٹرنیشنلسٹوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ یوں یہ ایک مخلوط حکومت تھی۔ انقلاب کے بعد صرف فسطائی 'بلیک ہنڈرڈ' پر پابندی عائد کی گئی۔ حتیٰ کہ بورژوا لبرل پارٹی (کیڈٹوں) کو بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت تھی۔ نئے انقلابی اقتدار کی بنیاد تاریخ کا سب سے جمہوری نظام، یعنی مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کی سوویتیں تھیں۔ اِن سوویتوں کو معیشت، زراعت، صنعت، فوج اور سماج کا انتظام جمہوری طریقے سے چلانے کے لئے نیچے سے اوپر تک منظم کیا گیا تھا۔ لینن نے سوویت نظام کے رہنما اصول غیر مبہم طور پر وضع کئے تھے:

*سوویت ریاست کے تمام عہدوں کے لئے جمہوری انتخابات

*تمام حکام کو کسی بھی وقت واپس بلانے کا اختیار

* کسی بھی اہلکار کی اجرات کا ہنرمند مزدور سے زیادہ نہ ہونا

بالشویک انقلاب 1917ء

* سماج اور ریاست کو چلانے کے تمام فرائض کی باری باری سب کی طرف سے ادائیگی

یہ انقلاب محکوم اور استحصال زدہ محنت کش طبقات کے لئے کیا معانی رکھتا تھا، اس کی تصویر کشی بڑے پرتاثیر انداز سے جان ریڈ نے کی ہے: ’’کسی بنجر زمین پر موتیوں کی طرح سارے افق پر دارالحکومت کی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں، جو رات کے وقت دن سے کہیں زیادہ شاندار لگ رہی تھیں۔ بوڑھا خاکروب، جو ایک ہاتھ سے ریڑھی چلا رہا تھا اور دوسرے سے راہ گزر پر جھاڑو دے رہا تھا، دور سے دمکتے دارالحکومت کو دیکھ کر بے ساختہ چلّا اٹھا، ’میرا! سارا پیٹروگراڈ اب میرا ہے!‘‘‘ انقلاب سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی طور پر محنت کش طبقے کو بے نظیر بلندیوں پر لے گیا تھا!

اگر انقلابی فتح کی وضاحت سائنسی تجزیئے سے کی جا سکتی ہے تو مارکسسٹوں پر یہ تاریخی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ بعدازاں انقلاب کی زوال پذیری اور سوویت یونین کے انہدام کی سائنسی وضاحت کریں۔ درحقیقت انقلاب کے رہنما ولادیمیر لینن نے ایک ملک میں سوشلزم کی تعمیر کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بین الاقوامیت لینن کے لئے کوئی جذباتی لفاظی نہیں تھی۔ وہ انقلاب کو معاشی و تکنیکی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ممالک تک پھیلانے کی ناگزیر ضرورت سے بخوبی واقف تھا۔ یوں مارکسسٹوں نے سوویت یونین کے انہدام کی مشروط پیش گوئی عرصہ قبل کردی تھی۔ 7 مارچ 1918ء کو صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے لینن نے واضح کیا: ’’اگر ہم تنہا رہ جاتے ہیں، اگر دوسرے ممالک میں انقلابی فتوحات حاصل نہیں ہوتیں تو حتمی فتح کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی... ایک کل یورپی انقلاب ہی اِن مصائب سے ہمیں نجات دلا سکتا ہے... اگر جرمن انقلاب برپا نہیں ہوتا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔‘‘

لینن کے ہمراہ انقلاب کی قیادت کرنے والے لیون ٹراٹسکی نے 1936ء میں شائع ہونے والی اپنی عمیق تصنیف ’انقلاب سے غداری‘ میں سٹالن کے تحت انقلاب کی زوال پذیری کا تجزیہ پیش کیا۔ 1980ء کی دہائی میں ہونے والے دیوہیکل واقعات کی پیش گوئی ٹراٹسکی نے پانچ دہائیاں قبل کی۔ اس نے واضح کیا تھا کہ اگر ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں انقلاب نہیں ہوتا اور سوویت یونین میں ایک سیاسی انقلاب مزدور جمہوریت کو بحال نہیں کرتا تو سرمایہ داری کی بحالی ناگزیر ہے۔ ٹیڈ گرانٹ نے 1943ء میں شائع ہونے والی اپنی تصنیف ’ریاست کا مارکسی نظریہ‘ میں اِس عمل کے تجزیئے کو مزید آگے بڑھایا۔ اس کا تناظر منفی طور پر درست ثابت ہوا۔

1917ء کا انقلابِ روس کوئی الگ تھلگ قومی واقعہ نہیں تھا بلکہ اس کے دور رس بین الاقوامی اثرات مرتب ہوئے۔ اس نے روس میں نہ صرف سرمایہ داری اور جاگیرداری کو اکھاڑا بلکہ سامراج کی بیڑیاں بھی توڑ ڈالیں۔ یہ

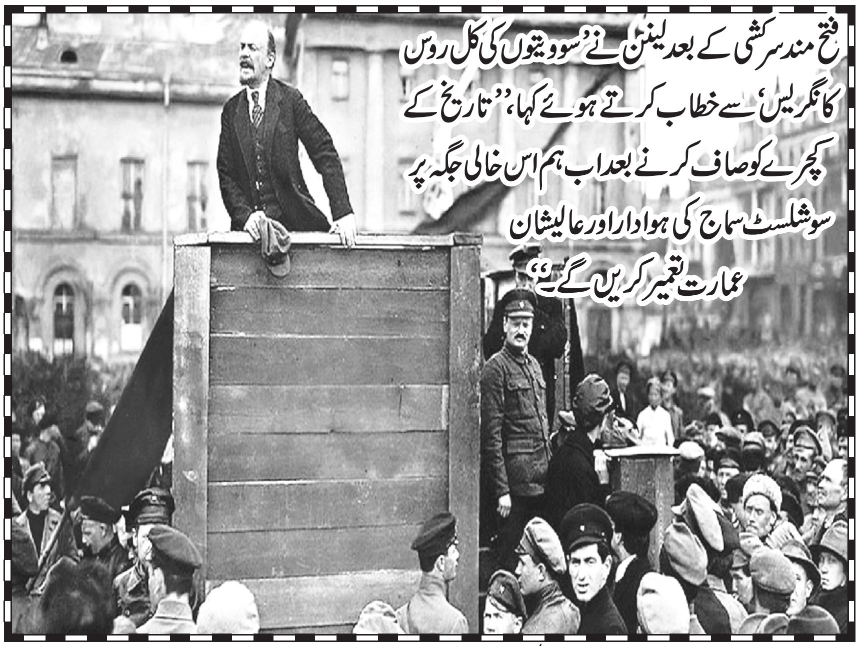

سوویت یونین کی سرحدوں سے بہت دور (بالخصوص یورپ میں) انقلابی ابھاروں کا محرک بنا۔ سامراجی آقا اِن عوامی بغاوتوں سے لرز گئے جو سرمایہ داروں کے قلعوں میں ابھرنے لگی تھیں۔ برطانوی وزیراعظم لائڈ جارج نے اپنے فرانسیسی ہم منصب کلیمنسو کو 1919ء کے ورسائی کے امن اجلاس کے دوران ایک خفیہ مراسلے میں لکھا: ’’پورا یورپ انقلابی جذبات سے لبریز ہے۔ موجودہ حالات کے خلاف محنت کشوں میں نہ صرف عدم اطمینان بلکہ غصے اور بغاوت کا گہرا احساس موجود ہے۔ یورپ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سارے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام پر عوام سوال اٹھا رہے ہیں۔‘‘

انقلاب کے مرکز کو کچلنے کے لئے اِن سرمایہ دارانہ ’جمہوریتوں‘ نے نومولود سوویت ریاست پر دیوہیکل حملہ کیا۔ اکیس سامراجی ممالک کی افواج روس پر چڑھ دوڑیں۔ خود انقلاب نسبتاً پرامن معاملہ تھا۔ اکتوبر کی سرکشی کے دوران صرف نو لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ لیکن یہ سامراجی عسکری جارحیت تھی جس نے پہلے سے عالمی جنگ میں تباہ حال پسماندہ ملک کو خونریزی اور قحط میں غرق کر دیا۔ عوام کی انتہائی محرومی اور بدحالی، جسے خانہ جنگی اور معاشی ناکہ بندی نے شدید تر کر دیا، کی وجہ سے ’’ذاتی بقا کی جدوجہد‘‘ ختم یا کم نہیں ہوئی بلکہ وحشی کردار اختیار کر گئی۔ جرمنی (1918ء اور پھر 1923ء)، چین (1924-25ء) اور برطانیہ (1926ء) میں انقلابات کی شکست سے بالشویک انقلاب کو شدید دھچکا لگا۔ اِن شکستوں نے انقلابِ روس کی تنہائی اور قومی زوال پذیری کو شدید تر کر دیا۔

سرخ فوج کی دلیرانہ مزاحمت اور حملہ آور ریاستوں کے مزدوروں اور سپاہیوں کی حمایت نے سامراجی جارحیت کو شکست دی۔ ٹراٹسکی نے زار کی بچی کھچی چند لاکھ کی تباہ حال فوج کو پچاس لاکھ کی مضبوط اور منظّم سرخ فوج میں تبدیل کر دیا۔ لیکن بالشویک پارٹی کے ہراوّل کارکنان اور باشعور مزدور اِس خانہ جنگی میں بڑی تعداد میں مارے گئے۔ اِس سے قیادت کا خلا پیدا ہوا جسے پارٹی اور سوویت حکومت میں گھسنے والے موقع پرستوں نے بھرا۔ ضروریات زندگی کی شدید قلت، صنعت و زراعت کے انہدام اور ثقافتی پسماندگی نے انقلاب کی افسر شاہانہ زوال پذیری میں اہم کردار ادا کیا۔ لینن 1924ء میں اپنی موت تک اِس زوال پذیری کے خلاف جدوجہد کرتا رہا۔ سٹالن نے اس کی وصیت کو کریملن کی آہنی الماریوں میں چھپا دیا۔ اِس وصیت میں لینن نے سٹالن کو پارٹی کے سیکرٹری جنرل کے عہدے سے ہٹانے اور افسر شاہی کے خلاف جدوجہد کی کال دی تھی۔ یہ دستاویز سٹالن کی موت کے بعد 1956ء میں پارٹی کی بیسویں کانگریس میں کہیں جا کر سامنے آئی۔ یوں تلخ معروضی حالات اور جنگ و انقلاب سے پرولتاریہ کے ہراوّل دستے کی تھکاوٹ نے وہ صورتحال پیدا کی جس میں سٹالن کے تحت ریاستی اقتدار کے گرد ایک افسر شاہانہ پرت ابھرنے لگی۔

ٹراٹسکی نے 'لیفٹ اپوزیشن' قائم کی اور اِس زوال پذیری کے خلاف مردانہ وار مزاحمت کی۔ لیکن اِسے انتہائی جبر سے کچل دیا گیا۔ یہ عمل وسیع مراعات رکھنے والے افسر شاہانہ ڈھانچے کے استحکام پر منتج ہوا۔ اجرتوں میں زیادہ سے زیادہ فرق، جو لینن کے دور میں 4:1 طے کیا گیا تھا، ختم کر دیا گیا۔ اکتوبر انقلاب کے خلاف یہ سیاسی ردِ انقلاب اتنا جابر تھا کہ 1940ء تک 1917ء میں انقلاب کی قیادت کرنے والی بالشویک مرکزی کمیٹی میں سے صرف ایک انسان باقی بچا تھا۔ یہ سٹالن خود تھا۔ باقی تمام قیادت کو جعلی مقدمات اور شو ٹرائلز کے بعد سزائے موت دے دی گئی، قتل یا 'غائب' کروا دیا گیا یا پھر انہوں نے خودکشی کر لی۔ بہت کم تھے جو طبعی موت مرے۔

تاہم سٹالنسٹ زوال پذیری کے باوجود معیشت ریاست کی ملکیت اور منصوبہ بندی میں رہی۔ یہ افسر شاہی کوئی طبقہ نہیں تھی، کیونکہ یہ ذرائع پیداوار کی مالک نہیں تھی، بلکہ یہ ایک طفیلی پرت تھی جو سوویت محنت کش طبقے کی پیدا کردہ قدر زائد کا ایک بڑا حصہ ہڑپ کر جاتی تھی۔ تاہم معیشت پر اِس بھاری بوجھ اور افسر شاہانہ بد انتظامی کے باوجود سوویت منصوبہ بند معیشت نے انسانی تاریخ کی تیز ترین ترقی کی۔ چند دہائیوں میں سوویت یونین ایک پسماندہ زرعی ملک سے ترقی یافتہ صنعتی ملک بن گیا۔ سرمایہ داری کی پوری تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

ٹیڈ گرانٹ نے اپنی پر مغز کتاب 'روس، انقلاب سے ردِ انقلاب تک' میں لکھا: ''1913ء (قبل از جنگ پیداوار کا عروج) کے بعد کے پچاس سالوں میں دو عالمی جنگوں، بیرونی جارحیت، خانہ جنگی اور دوسری بربادیوں کے باوجود کل صنعتی پیداوار میں 52 گنا اضافہ ہوا۔ اِس دوران امریکہ میں یہ اضافہ چھ گنا جبکہ برطانیہ میں دو گنا سے بھی کم تھا۔ دوسرے الفاظ میں سوویت یونین ایک پسماندہ زرعی ملک سے دنیا کی دوسری سب سے طاقتور قوم بن گیا، جس کے پاس ایک دیوہیکل صنعتی بنیاد، اعلیٰ ثقافتی معیار اور امریکہ، یورپ اور جاپان میں سائنسدانوں کی کل تعداد سے زیادہ سائنسدان تھے۔ اوسط عمر میں دو گنا سے زیادہ اضافہ ہوا اور بچوں میں شرح اموات میں نو گنا کمی واقع ہوئی۔ اتنی مختصر مدت میں اتنی تیز معاشی پیش رفت کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔''

انقلاب نے جنسی برابری اور زندگی کے ہر شعبے میں خواتین کی شمولیت کو یقینی بنایا۔ حکومت سکولوں میں مفت کھانا، بچوں کے لئے دودھ، حاملہ خواتین اور زچہ بچہ کے لئے طبی مراکز، دارالاطفال اور پرورش خانے مہیا کرتی تھی۔ تعلیم و علاج سمیت یہ تمام سہولیات بالکل مفت تھیں۔ رہائش کا مسئلہ حل کرنے کے لئے پانچ کروڑ سے زیادہ فلیٹ تعمیر کئے گئے۔ ریاست روزگار کی ضامن تھی اور بیروزگاری ایک جرم تصور ہوتی تھی۔ یوں منصوبہ بند معیشت نے منڈی کی معیشت پر اپنی فوقیت جدلیات کی زبان میں نہیں بلکہ ٹھوس مادی اور ثقافتی ترقی میں ثابت کی۔

تاہم معیشت جوں جوں پھیلتی گئی، زیادہ پیچیدہ، ثقیف اور ترقی یافتہ ہوتی گئی۔ چند ہزار اشیا پیدا کرنے والی معیشت کی منصوبہ بندی چند سو افسران کر سکتے ہیں۔ لیکن دس لاکھ اشیا بنانے والی معیشت کو افسر شاہانہ طریقوں سے نہیں چلایا جا سکتا۔ ٹراٹسکی نے واضح کیا تھا کہ ''ایک منصوبہ بند معیشت کے لئے مزدور جمہوریت اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسانی جسم کے لئے آکسیجن۔'' 1960ء تک سوویت معیشت ایک دیوہیکل حجم حاصل کر چکی تھی اور یہ امریکہ کے بعد دنیا کی دوسری بڑی معیشت تھی جو کپڑوں اور جوتوں سے لے کر ہوائی جہاز اور خلائی راکٹ تک پیدا کرتی تھی۔ افسر شاہی کی بد انتظامی، بدعنوانی، عیاشیوں اور ضیاں کے بوجھ تلے اِس معیشت کا دم گھٹ رہا تھا۔ نتیجتاً آخر کار معاشی نمو کی شرح ایک وقت پر صفر ہو گئی۔ دوسری طرف سوویت افسر شاہی کی ہوس اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ اب اپنی مراعات کو اپنے بچوں تک منتقل کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ذرائع پیداوار کو اپنی نجی ملکیت میں لے کر ایک بالادست سماجی پرت سے ایک حکمران طبقے میں تبدیل ہونا چاہتے تھے۔ گورباچیف کے دور میں سٹالنسٹ افسر شاہانہ ڈھانچے میں رہتے ہوئے معیشت کو بحال کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن اِس سے تضادات شدید تر ہی ہوئے۔ انقلاب کی تنہائی، سوشلزم کی مسخ شدہ 'قومی شکل' اور مزدور جمہوریت کی عدم موجودگی میں معاشی بد انتظامی آخر کار سوویت یونین کے انہدام پر منتج ہوئی۔ سوویت یونین میں سوشلزم یا کمیونزم نہیں بلکہ اس کی مسخ شدہ شکل، یعنی سٹالنزم ناکام ہوا۔

آج عالمی سطح پر سرمایہ داری کا بحران انسانیت کی وسیع اکثریت کو غربت، محرومی، جنگوں، دہشت گردی، ماحولیاتی تباہی اور بیماری میں غرق کر رہا ہے۔ یہ تاریخی طور پر متروک نظام ہے اور نسل انسان کی اذیت میں اضافہ ہی کر سکتا ہے۔ آج سرمایہ داری زائد پیداوار، زائد پیداواری صلاحیت اور شرح منافع میں گراوٹ کے اسی نامیاتی بحران کا شکار ہے جس کی نشاندہی مارکس نے کی تھی۔ حتیٰ کہ سنجیدہ اور دور اندیش بورژوا معیشت دان بھی اس بحران کی نامیاتی نوعیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

آج کی تحریکوں اور بغاوتوں کو ایک متبادل نظام اور نظریئے کی ضرورت ہے۔ بے شمار سابقہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ آج انقلابی سوشلزم سے منحرف ہو کر 'تاریخ کے خاتمے' پر ایمان لا چکے ہیں۔ لیکن اِس سے بھی بڑا کھلواڑ مارکسزم کو 'جدید' بنانے کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ 1917ء میں انقلاب کی خبر دو ہفتوں بعد برصغیر پہنچی تھی۔ لیکن آج انقلابات ٹیلیوژن اور انٹرنیٹ پر براہ راست دیکھے جاتے ہیں۔ لہٰذا آج اگر بالشویک انقلاب جیسا کامیاب سوشلسٹ انقلاب برپا ہوتا ہے تو اسے قومی حدود میں مقید کرنا پہلے سے کہیں زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ سوویت یونین کے انہدام کے باوجود بالشویک انقلاب آج بھی نسل انسان کی نجات کی جدوجہد کے لئے مشعل راہ ہے۔ گزشتہ پچیس سالوں کے دوران حکمران طبقات اور ان کے پروردہ سیکولر اور مذہبی لیڈروں اور دانشوروں نے مارکسزم کو 'ناکام' ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کی ہے۔ انہیں سوشلزم کی موت کا اعلان بار بار کرنا پڑتا ہے، جو بذات خود ایک ستم ظریفی ہے۔ تاہم سرمایہ داری کے سنجیدہ پالیسی ساز اِس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ان کے استحصالی نظام کو حقیقی خطرہ آج بھی انقلابی سوشلزم سے ہے۔ 'اکانومسٹ' کو انقلاب روس کے صد سالہ جشن کی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑا: ''انقلاب کی صد سالہ سالگرہ اتنا بڑا واقعہ ہے کہ اِسے مخفی رکھنا ممکن نہیں... مسٹر پیوٹن نے لینن کو نظر انداز اور سٹالن کو بحال کیا ہے۔ اس کی نظر میں ان کے درمیان فرق، روسی ریاست اور اس کی شاہی وراثت کی طرف رویے کا تھا... لینن سے اس کا کلیدی اختلاف یہ ہے کہ لینن نے روس کو حق خود ارادیت رکھنے والی جمہوریاؤں کی یونین کے طور پر منظم کیا... معیشت جمود کا شکار ہے اور مسٹر پیوٹن کا خبط بڑھتا جا رہا ہے۔ بالشویک انقلاب کے بھوت بے چین ہو رہے ہیں۔ لینن اب شاید خود کو مسکرانے کی اجازت دے سکتا ہے!'' 'اکانومسٹ' شاید صرف پیوٹن کے سرمایہ دارانہ روس کا حوالہ دے رہا ہے، لیکن یہ کیفیت کم و بیش ہر ملک کے لئے درست ہے۔

لینن اور ٹراٹسکی نے روس سے شروع ہونے والے انقلاب کو پھیلانے اور دنیا بھر کے لوگوں کو یکجا کر کے پورے کرۂ ارض کو 'سوویت جمہوریاؤں کی یونین' (USSR) بنانے کا عزم کیا تھا۔ آج کے عہد میں کسی ایک ملک میں سوشلسٹ فتح پورے سیارے پر انقلابی طوفان پیدا کر سکتی ہے۔ بالشویک انقلاب کے قائدین کا خواب تبھی پورا ہو گا اور انسان اپنے وجود کے حقیقی مقصد، یعنی کائنات کی تسخیر کی طرف گامزن ہو گا۔

جموں کشمیر انتخابات:

نوآبادیاتی جبر کیخلاف نفرت کا ووٹ!

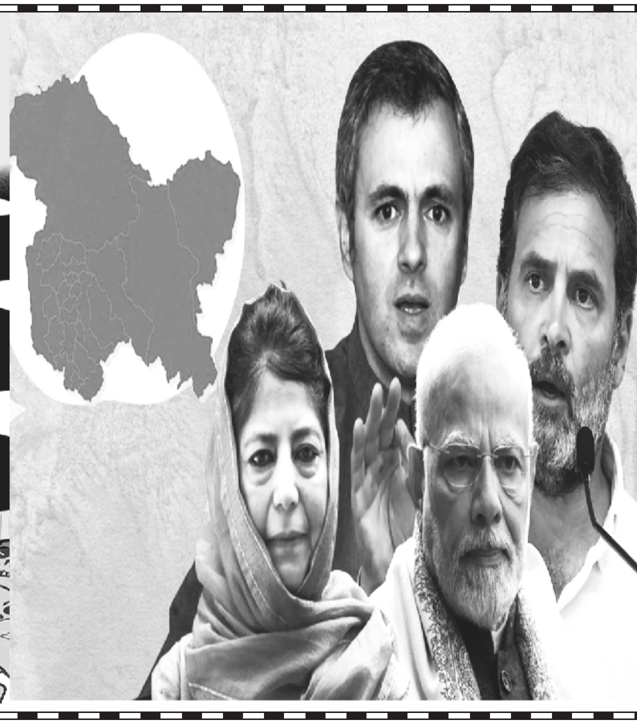

بی جے پی نے انتخابات جیتنے کے لیے پانچ سالہ منصوبہ بندی کی تھی۔ تاہم ووٹروں نے یہ تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے ہیں۔ جموں کشمیر نیشنل کانفرنس اپنے اتحادیوں کے ہمراہ حکومت بنانے کی مضبوط پوزیشن میں ہے اور عمر عبداللہ کو وزیر اعلیٰ نامزد کر دیا گیا ہے۔

تحریر: حارث قدیر

بھارتی زیرانتظام جموں کشمیر میں 10 سال بعد بالآخر اسمبلی انتخابات تین مرحلوں میں مکمل ہوکر نتائج جاری ہو چکے ہیں۔ 10 سال بعد البتہ یہ انتخابات ماضی کی خصوصی حیثیت والی جموں کشمیر ریاست کی بجائے ایک مرکز کے زیر انتظام علاقے (یونین ٹیرٹری) کی ایک برائے نام اسمبلی کے لیے ہوئے ہیں۔ منتخب ہونے والی حکومت مکمل طور پر مرکز میں حکمران بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کی طرف سے نامزد کردہ لیفٹیننٹ گورنر کے رحم وکرم پر ہوگی۔

بی جے پی نے انتخابات جیتنے کے لیے پانچ سالہ منصوبہ بندی کی تھی۔ تاہم ووٹروں نے یہ تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے ہیں۔ جموں کشمیر نیشنل کانفرنس اپنے اتحادیوں کے ہمراہ حکومت بنانے کی مضبوط پوزیشن میں ہے اور عمر عبداللہ کو وزیر اعلیٰ نامزد کر دیا گیا ہے۔ بی جے پی فرقہ وارانہ تقسیم اور علاقائی تقسیم کو ہوا دے کر اپنے حق میں جو نتائج حاصل کرنا چاہتی تھی اس میں اسے نہ صرف بری طرح ناکامی ہوئی ہے بلکہ پچھلے الیکشن کی نسبت زیادہ نشستیں جیتنے کے باوجود جموں ریجن تک محدود ہوکر رہ گئی ہے۔

حکمران جماعت بی جے پی نے 2014ء میں اقتدار میں آنے سے قبل جموں کشمیر کی خصوصی حیثیت کو ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ جسے 2019ء کے انتخابات میں بھی دہرایا گیا تھا۔ مسلسل دوسرے دور اقتدار میں بی جے پی نے اپنے اس وعدے پر پہلی فرصت میں عملدرآمد کیا۔ وزیراعظم نریندر مودی کا مسلسل یہ دعویٰ رہا ہے کہ جموں کشمیر کی ترقی کی راہ میں خصوصی حیثیت رکاوٹ تھی اور ساتھ ہی مسلح بغاوت اور علیحدگی (آزادی) کی آوازوں کی وجہ بھی خصوصی حیثیت کو ہی قرار دیا جاتا رہا ہے۔ مجموعی طور پر بی جے پی اور اس کی مدر آرگنائزیشن راشٹریہ سوائم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے مطابق جموں کشمیر میں موجود تمام مسائل کی جڑ خصوصی حیثیت ہی تھی۔

2019ء میں خصوصی حیثیت کے خاتمے کے بعد سب سے پہلے غیر ریاستی شہریوں کو جموں کشمیر میں آباد کرنے کے اقدامات کیے گئے اور 12 ہزار سے زائد ڈومیسائل جاری کیے گئے۔ دوسرا اقدام حلقہ بندیوں کی صورت کیا گیا۔ قانون ساز اسمبلی کی نشستوں میں 7 کا اضافہ کیا گیا۔ یہ اضافہ ہندوتوا کے ایجنڈے کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا۔ اکثریتی آبادی پر مشتمل کشمیر وادی، جو مسلم اکثریتی علاقہ بھی ہے، کو ایک اضافی نشست ملی۔ جبکہ آبادی میں اقلیتی اور ہندو اکثریتی علاقے جموں کے لیے 6 نشستوں کا اضافہ کیا گیا۔

ہندو وزیر اعلیٰ تعینات کرنے کا ایجنڈا پیش کر کے حلقہ بندیوں میں بھرپور کوشش کی گئی کہ ہندو اکثریتی حلقوں میں اضافہ کیا جائے۔ یوں جموں میں ہندو اکثریتی حلقوں کی تعداد 24 سے بڑھا کر 31 کر دی گئی اور مسلم اکثریتی حلقوں کی تعداد 12 سے کم کر کے 9 کر دی گئی۔

وادی کشمیر میں ریاست کی 56.15 فیصد آبادی رہتی ہے جبکہ جموں میں 43.85 فیصد آبادی رہتی ہے۔ پچھلی اسمبلی میں وادی کشمیر کی 46 نشستیں تھیں۔ اب 47 ہوگئی ہیں۔ تاہم جموں کی 37 نشستیں بڑھا کر 43 کر دی گئی ہیں۔ بی جے پی

عمر عبداللہ اور فاروق عبداللہ کے لیے صرف یہی چیلنج نہیں ہے کہ انہیں چھینے ہوئے آئینی، سیاسی اور مالیاتی اختیارات واپس حاصل کرنے ہیں بلکہ عوام کے معاشی مسائل کو حل کرنے اور تقریباً منجمد معیشت کا پہیہ دوبارہ چلانے کا چیلنج بھی درپیش ہے۔

کے ہندوتوا ایجنڈے کی منصوبہ بندی کا انداز اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جموں کشمیر میں 28 فیصد ہندو آبادی کو نئی حلقہ بندیوں کے بعد 34.44 فیصد نشستیں دی گئی ہیں۔

لوک سبھا کے 5 انتخابی حلقوں کی بھی نئی حلقہ بندیوں میں اس تقسیم کو بڑھاوا دینے کا خصوصی انتظام کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے راجوری اور اننت ناگ کو ملا کر ایک انتخابی حلقہ بھی بنایا گیا تھا۔ تاہم اس میں بھی بی جے پی کو مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو پائے تھے۔

جموں کے پہاڑی علاقے پیر پنجال کے 8 انتخابی حلقوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے بی جے پی نے پہاڑی قبائل کو شیڈول ٹرائب میں شامل کر کے ملازمتوں اور تعلیم میں خصوصی کوٹے کا حقدار بھی بنایا۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس اسمبلی میں 5 مخصوص نشستیں بھی رکھی گئی ہیں جن کا انتخاب منتخب ممبران اسمبلی نہیں کریں گے بلکہ ان کی نامزدگی لیفٹیننٹ گورنر منوج سنہا کریں گے۔ ان نامزد ہونے والے ممبران اسمبلی میں دو خواتین، دو کشمیری پنڈت اور ایک پاکستان سے ہجرت کر کے جانے والے ہندو مہاجرین کی نشست ہو گی۔ ان ممبران کو براہ راست منتخب ہونے والے ممبران کے برابر حقوق حاصل ہوں

گے۔ اس طرح مرکزی حکومت کو تمام تر تعصّبات کو استعمال کرنے کے بعد بھی اگر کامیابی نہ مل پائی تو 5 نشستوں کا ٹرمپ کارڈ ان کے پاس محفوظ تھا۔

بہر حال رائے دہندگان نے بی جے پی کی تمام حکمت عملی کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اب 5 ممبران کی نامزدگی کے اختیار کے باوجود 'ہندو' وزیر اعلیٰ بنانے کا منصوبہ خاک میں مل چکا ہے۔ الیکشن کمیشن کے نتائج کے مطابق 90 نشستوں میں سے 42 نیشنل کانفرنس، 29 بی جے پی، 6 انڈین نیشنل کانگریس، 3 پی ڈی پی، 1 کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) (سی پی آئی ایم)، 1 پیپلز کانفرنس، 1 عام آدمی پارٹی، جبکہ 7 آزاد امیدواروں نے جیتی ہیں۔

مجموعی طور پر انتخابات میں بی جے پی نے سب سے زیادہ ووٹ لیا ہے۔ پہلی بار بی جے پی کشمیر ویلی میں بھی ووٹ لینے میں کامیاب ہوئی ہے۔ تاہم نشست کوئی نہیں جیت سکی ہے۔ بی جے پی کی گزشتہ اسمبلی میں اتحادی پی ڈی پی بری طرح شکست سے دوچار ہوئی ہے اور 28 نشستوں سے 3 نشستوں تک محدود ہو گئی ہے۔

نیشنل کانفرنس واحد ایسی پارٹی رہی ہے جس کے کامیاب ہونے والے امیدواروں میں مسلم اور ہندو دونوں شامل ہیں۔ کانگریس اپنے ماضی کے گڑھ جموں کے ہندو اکثریتی حلقوں میں بری طرح شکست سے دوچار ہوئی ہے۔ انتخابی تجزیہ کاروں کے مطابق کانگریس نے جموں میں انتخابی مہم چلانے کی بجائے وادی کشمیر میں مہم چلانے کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے 5 امیدوار کشمیر سے اور 1 جموں سے کامیاب ہوا ہے۔ اس انتخابی پالیسی کو نیشنل کانفرنس نے بارہا تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ نیشنل کانفرنس کو وادی کشمیر سے 5، 3 اور جموں سے 7 نشستیں ملی ہیں۔ آزاد امیدواروں کے شامل ہونے کے بعد جموں سے نیشنل کانفرنس کی نشستوں میں اضافہ ہو جائے گا۔

جنوبی کشمیر کے کلگام حلقے سے یوسف تاریگامی کا مسلسل پانچویں بار الیکشن جیتنا بھی ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ وہ اس اسمبلی میں منتخب ہونے والے واحد کمیونسٹ رہنما ہیں۔ اس بار ان کا مقابلہ جماعت اسلامی کے حمایت یافتہ آزاد امیدوار سیار احمد رشی سے تھا جنہوں نے اس انتخاب کو اسلام اور کفر کی جنگ بنا کر پیش کر رکھا تھا۔ تاہم اس کے باوجود محنت کشوں کے نمائندہ سرخ پرچم اور درانتی ہتھوڑے کے انتخابی نشان پر یوسف تاریگامی کامیاب ہوئے۔

نیشنل کانفرنس اور اس کے اتحادیوں کو یہ انتخابی فتح آرٹیکل 370 کی صورت خصوصی حیثیت کی بحالی، ریاستی تشخص اور باعزت زندگی کے انتخابی وعدوں پر حاصل ہوئی ہے۔ بالخصوص وادی کشمیر میں ووٹروں نے بی جے پی کے پچھلے پانچ سال کے اقدامات کو مسترد کرتے ہوئے اپنا ووٹ تقسیم کرنے کی بجائے ایک جماعت کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ درحقیقت یہ کمتر برائی کے حق میں دیا گیا عوامی فیصلہ ہے جس کا جموں کشمیر میں عام تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ نیشنل کانفرنس اور اس کی اتحادی جماعتوں سے جموں کشمیر کے عوام بالخصوص نوجوانوں کو کوئی بہتری کی امید نہیں ہے۔ تاہم وہ اس وقت بی جے پی کے خوف سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت جموں کشمیر کے لوگوں کے لیے سب سے پہلا

ہدف بی جے پی سے نجات اور ریاست کی حیثیت کی بحالی ہے تاکہ وہ ماضی میں چھینے گئے مالی اور سیاسی اختیارات کی بازیابی کے لیے آگے کے سفر کی کوشش کرسکیں۔

عمر عبداللہ نے انتخابات میں فتح کے بعد جہاں ریاستی تشخص اور دفعہ 370 کی بحالی کے وعدہ کو دہرایا ہے وہیں اس وعدہ کی فوری تکمیل کے امکان کو بھی خود ہی رد بھی کیا ہے۔مبہم انداز میں البتہ انہوں نے بھارت کے ساتھ الحاق کے وقت 1947ء میں اپنے دادا شیخ عبداللہ کے ساتھ کیے گئے بھارتی حکومت کے وعدوں کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔قبل ازیں وہ لیفٹیننٹ گورنر کے سامنے مفلوج وزارت اعلیٰ کے منصب پر بیٹھنے سے انکار کر چکے تھے۔تاہم انتخابات میں فتح کے بعد وزارت اعلیٰ کے منصب پر بیٹھنے کے لیے وہ کافی جلدی میں نظر آئے۔ان کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہوگی کہ بھارتی سپریم کورٹ کے احکامات کے مطابق جموں کشمیر کی ریاستی حیثیت بحال کر دی جائے۔کیونکہ ان کی حکومت کو اپنے دعوؤں اور اعلانات پر عملدرآمد کرنے کے لیے مرکز میں حکمران بی جے پی کے رحم وکرم پر ہی رہنا ہوگا۔

5 اگست 2019ء میں جموں کشمیر تنظیم نو بل اور بعد ازاں دسمبر 2023ء میں جموں کشمیر تنظیم نو ترمیمی بل کی منظوری کے بعد بھارت کی دیگر یونین ٹیریٹریز کی اسمبلیوں کو حاصل اختیارات سے بھی جموں کشمیر کی اسمبلی کو محروم کر دیا گیا ہے۔پولیس، بیوروکریسی، اٹارنی جنرل اور پراسیکیوٹر کی خدمات پر لیفٹیننٹ گورنر کا کنٹرول ہوگا۔تقرریوں اور تبادلوں سے متعلق امور کے لیے لیفٹیننٹ گورنر کی منظوری لینا ہوگی۔ مالیاتی اختیارات بھی لیفٹیننٹ گورنر کی منظوری کے محتاج ہوں گے۔لیفٹیننٹ گورنر کا نمائندہ کابینہ کے تمام اجلاسوں میں شرکت کا پابند ہوگا اور وزرا کے شیڈول اور اجلاسوں کے ایجنڈے کم ازکم دو دن پہلے گورنر کے دفتر میں جمع کروانا ہوں گے۔سب سے بڑھ کر کی جانے والی قانون سازی بھی لیفٹیننٹ گورنر کی منظوری سے ہی مشروط ہوگی۔لیفٹیننٹ گورنر کے اعتراض کے بعد اسمبلی دوبارہ کوئی بل منظور کر دے تو لیفٹیننٹ گورنر اسے منظور کرنے کے پابند ہوتا ہے۔تاہم جموں کشمیر میں ایسا نہیں ہے۔

اس طرح عملی طور پر یہ اسمبلی ایک بلدیاتی ادارے سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتی اور نئی منتخب ہونے والی حکومت اپاہج ہی ہوگی۔عملی طور پر لیفٹیننٹ گورنر اور اس کے ذریعے بی جے پی کی مرکزی حکومت کی حکمرانی کا سلسلہ مستقبل قریب میں بھی برقرار ہی رہے گا۔

نیشنل کانفرنس کی ساری تاریخ اور جموں کشمیر کے بھارت کے ساتھ سیاسی تعلق کو اگر دیکھا جائے تو 1947ء میں کیے گئے عارضی الحاق کے بعد بتدریج اختیارات چھینے جانے کا ایک عمل نظر آتا ہے۔ہر بار جب مرکز کی طرف سے آئینی اور سیاسی حملہ کیا گیا تو نیشنل کانفرنس نے کبھی معمولی اور کبھی طویل مزاحمت تو کی۔لیکن آخری تجزیے میں مرکز کے ساتھ کمپرومائز کی پالیسی ہی اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ دفاع، کرنسی اور مواصلات کے علاوہ تمام آئینی، سیاسی اور مالی اختیارات کی حامل نیم خودمختار ریاست کے حکمران شیخ عبداللہ خاندان کی تیسری نسل کو اسی ریاست کے ایک ٹکڑے کی لیفٹیننٹ گورنر کے تابع مفلوج حکومت کا وزیراعلیٰ بننا بھی قبول کرنا پڑ رہا ہے۔

عمر عبداللہ اور فاروق عبداللہ کے لیے صرف یہی چیلنج نہیں ہے کہ انہیں چھینے ہوئے آئینی، سیاسی اور مالیاتی اختیارات واپس حاصل کرنے ہیں بلکہ عوام کے معاشی مسائل کو حل کرنے اور تقریباً منجمد معیشت کا پہیہ دوبارہ چلانے کا چیلنج بھی درپیش ہے۔جس کے لیے ان کے پاس کوئی اختیار موجود نہیں ہے۔ جموں کشمیر میں اس وقت بیروزگاری گزشتہ 45 سال کی بلند ترین شرح پر موجود ہے۔اس وقت اس خطے میں 28.2 فیصد بیروزگاری کی شرح ہے جو ملک (بھارت) کی بیروزگاری کی شرح 6.1 فیصد سے بہت زیادہ ہے۔25 لاکھ نوجوان نوکری کی تلاش میں ہیں۔

لیفٹیننٹ گورنر منوج سنہا

10 لاکھ تعلیم یافتہ نوجوان نوکریوں سے محروم ہیں۔ دوسری جانب 65 فیصد سرکاری آسامیاں خالی ہیں۔تاہم ان پر تقرریوں کے لیے لیفٹیننٹ گورنر کی منظوری درکار ہوگی۔خطے میں 60 ہزار دیہاڑی دار مزدور محض 300 روپے یومیہ کما پا رہے ہیں۔مودی حکومت کے بھاری اعلانات محض اعلانات تک ہی محدود رہے ہیں اور انڈسٹریل گروتھ کے دعوے بھی پورے نہیں ہوسکے۔سال انڈسٹریز، جو اس خطے کی معیشت میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں، بقا کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور معیشت رکی ہوئی ہے۔

مرکز نے 2024-25ء کے مرکزی بجٹ میں جموں کشمیر کے لیے 422 ارب 77 کروڑ بھارتی روپے مختص کیے ہیں جو مودی حکومت کے دعوؤں کے برعکس گزشتہ مالی سال کے مقابلے میں 1.2 فیصد کا معمولی اضافہ ہے۔خطے کا کل بجٹ 1183 ارب 90 کروڑ بھارتی روپے ہے۔

مودی حکومت کا ایک اور دعویٰ تھا کہ جموں کشمیر سے عسکریت پسندی کو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔تاہم عسکریت پسندی وادی کشمیر میں اگر کسی حد تک ترک کی گئی ہے تو جموں عسکری کارروائیوں کا نیا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ان عسکری حملوں کو البتہ ماضی کی طرح میڈیا پر زیادہ جگہ نہیں مل رہی ہے۔سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 2021ء کے بعد جموں میں عسکریت پسندوں سے جڑے 33 حملے ہوئے ہیں۔صرف 2024ء میں خطے میں 8 حملے ہوئے جن میں 11 فوجی ہلاک اور 18 زخمی ہوئے۔وادی کشمیر میں عسکریت کو ہی نہیں بلکہ پاکستان نواز نام نہاد حریت قیادتوں کو بھی عوام نے بری طرح مسترد کیا ہے۔جماعت اسلامی کے رہنماؤں سمیت دیگر کچھ نام نہاد حریت رہنماؤں نے آزاد حیثیت میں انتخابات میں حصہ لیا۔لیکن ضمانتیں بچانے میں بھی ناکام رہے ہیں۔

جموں کشمیر کے عوام نے البتہ اس حکمران اشرافیہ سے کوئی امید نہیں لگا رکھی ہے۔نہ ہی ان کا سیاسی شناخت ہی واحد مسئلہ ہے۔درحقیقت یہ ان تمام مسائل کا ابتدائی اظہار ہے جو مقامی حکمران اشرافیہ کی سہولت کاری کے نتیجے میں قائم سامراجی قبضے کی وجہ سے اس خطے کے محنت کشوں اور نوجوانوں کو درپیش ہیں اور ان سے نجات سامراجی قبضے اور سرمائے کی حاکمیت سے مکمل آزادی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔نیشنل کانفرنس اور اتحادیوں کی فتح درحقیقت کسی واضح متبادل کے فقدان کا شاخسانہ ہے۔ایک خلا ہے جسے انقلابی نظریات سے لیس واضح متبادل پروگرام کی حامل قوتوں کے ذریعے پر کیا جا سکتا ہے۔دوسری جانب بی جے پی کی پالیسیوں کے نتیجے میں جموں اور وادی کے مابین علاقائی تقسیم اب مذہبی تقسیم کی صورت میں مزید گہری اور پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے۔

یہ پولرائزیشن آخری تجزیے میں محنت کشوں اور نوجوانوں کو تحفظاتی پالیسیوں کے تحت حکمران اشرافیہ کے مفادات کا ایندھن بننے پر مجبور کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان انتخابات میں 68 فیصد سے زائد ووٹر ٹرن آؤٹ بھی سامنے آیا ہے اور نتائج میں ریاست کی پیوست کردہ مذہبی تقسیم اور تعصب کی گہری چھاپ بھی نظر آتی ہے۔انتخابی نتائج سے البتہ بی جے پی کی پالیسیوں کی وجہ سے عدم تحفظ کا شکار نوجوانوں اور محنت کشوں میں ایک اعتماد کی بحالی ضرور ہوگی۔جو آنے والے دنوں میں مستقبل کی نئی راہیں تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

بنگلہ دیش کی طلبہ تحریک:

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!

تحریر: عمر عبداللہ

دنیا بھر کی طرح جنوب ایشیا بھی پچھلے کچھ سالوں سے غیر معمولی سیاسی وسماجی ہلچل سے گزر رہا ہے۔ 2022ء میں سری لنکا میں طلبہ اور محنت کشوں کی احتجاجی تحریک کی جانب سے بدعنوان اور عوام دشمن صدر راجا پکسے کو بھاگنے پر مجبور کیے جانے کے بعد سے اٹھنے والی شورش کی لہر پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ طویل عرصے کی شکستوں یا بے عملی کے بعد صرف پچھلے چھ مہینوں میں خطے کے طلبہ اور محنت کش عوام نے اپنے بلند حوصلوں اور قربانیوں سے دو بڑی کامیابیاں سینچی ہیں۔ ایک طرف نوجوانوں کے ہراول کردار کے ساتھ پاکستانی زیر انتظام جموں کشمیر کے عوام نے پورے نوآبادیاتی ریاستی سیٹ اپ کو شکست دے کر سستی بجلی کا بنیادی حق چھینا ہے تو دوسری طرف بنگلہ دیش میں طلبہ نے طویل عرصے سے اقتدار کے ساتھ چمٹی حسینہ واجد کی آمرانہ حکومت کا تختہ الٹ کر اسے ملک سے بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اسی طرح کلکتہ میں نوجوان ڈاکٹر کے ریپ اور قتل کے خلاف ڈاکٹروں اور طلبا و طالبات کی تحریک سے لے کر پختونخواہ اور بلوچستان میں قومی جبر، سامراجی جنگوں اور آپریشنوں کے خلاف مزاحمتی تحریکوں کے ابھار سمیت اس وقت خطے میں متعدد چھوٹی بڑی سرکشیاں مسلسل آگے بڑھ رہی ہیں جو آنے والے دنوں میں طبقاتی کشمکش کے بڑے طوفانوں کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں۔

عام لوگ مسلسل گھرے ہوتے ہوئے معاشی بحران، سرمایہ دارانہ ریاستوں کی تاریخی ناکامیوں، آئی ایم ایف اور دیگر مالیاتی اداروں کی نیولبرل معاشی پالیسوں سے تنگ آ چکے ہیں۔ نیولبرل حکومتوں اور عالمی اداروں کے کاغذوں پر اعداد و شمار کے ہیر پھیر سے گھڑی گئی ترقی کی بوگس دیو مالائی داستانوں کی اصل حقیقت بھی اب کھل کر سامنے آنا شروع ہو چکی ہے۔ دنیا کے اس حصے میں آبادی کا ساٹھ سے ستر فیصد تک نوجوانوں پر مشتمل ہے جنہیں ان حالات میں اپنا مستقبل مسلسل تاریک ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ ایک طرف عالمی سامراج اور ان کے مقامی گماشتوں کی نمائندہ ریاستوں کے پاس اس کثیر جہتی بحران میں مروجہ پالیسیوں کو ہی جبراً نافذ کرنے اور ہر مزاحمت کو خون میں نہلا کر کچل دینے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے تو دوسری طرف اربوں محنت کشوں' بالخصوص ان کی نئی نسل کے پاس بھی اپنی زندگیوں کی بقا اور بہتر مستقبل کی امید کی خاطر لڑنے کے سوا دوسرا کوئی آپشن نہیں بچا۔ اس ساری کیفیت کا عکس بنگلہ دیش کی حالیہ طلبہ تحریک کے دوران ایک نوجوان کے پولیس کے ساتھ لڑتے ہوئے بندوقوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جانے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پولیس اس نوجوان کے سینے پر تین مرتبہ فائر کرتی ہے مگر ہر بار وہ زمین پر گر کر پھر سے کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنا سینہ آگ اگلتی بندوقوں کے سامنے دوبارہ تان لیتا ہے۔ یہ منظر تاریخ میں ظالم کے خلاف مزاحمت اور جرات کے استعارے کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ بنگلہ دیش کی تحریک نے اس طرح کے بے شمار استعاروں کو جنم دیا ہے جنہیں سوشل میڈیا کی بدولت پوری دنیا نے براہِ راست دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اس تحریک نے بنگلہ دیش کے اندر اور باہر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو اپنے اسباق کے ساتھ آنے والے دنوں میں دنیا بھر میں طبقاتی جدوجہد کی آگے کی جہتوں اور راستوں کا تعین کریں گے۔ جیسا کہ ہم پاکستان میں طلبہ کے حالیہ مظاہروں کی صورت میں دیکھ بھی رہے ہیں۔

10 جولائی 2024ء کو بنگلہ دیش کی سپریم کورٹ نے سول سروس کی تین ہزار سیٹوں پر 2018ء سے منسوخ شدہ کوٹہ سسٹم بحال کر دیا۔ اس سسٹم کے تحت 30 فیصد سیٹیں جنگ آزادی میں لڑنے والے خاندانوں کے لیے اور مزید 26 فیصد خواتین، معذوروں، اقلیتوں اور پسماندہ اضلاع کے لیے مختص تھیں۔ ماضی میں کچھ بھی رہا ہو لیکن اب یہ اول الذکر 30 فیصد کوٹہ حسینہ واجد اور عوامی لیگ کے ہاتھوں میں ایک اوزار بن چکا تھا جسے وہ سیاسی رشوت، بدعنوانی اور ریاست کے اندر اپنے حمایتی لوگوں کا غلبہ برقرار رکھ کر اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ دوسری طرف پڑھے لکھے نوجوانوں کو ان سرکاری نوکریوں کے علاوہ کوئی اور مناسب روزگار میسر نہ تھا۔ چنانچہ طلبہ نے اس متعصّبانہ پالیسی کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس مظہر سے بھی نام نہاد نیولبرل معاشی ترقی کے فراڈ کا پول بھی کھل جاتا ہے کہ مبینہ طور پر تیز ترین

ترقی کی سنہری مثال بنگلہ دیش کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان صرف تین ہزار نوکریوں کی خاطر لڑ مر جانے کو تیار ہیں۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کو طلبہ نے یکسر مسترد کر دیا اور احتجاج میں کود گئے۔ طلبہ کا اس قدر تیزی سے احتجاج میں منظم ہو جانا کوئی حادثہ نہیں تھا بلکہ 2018ء کی طلبہ تحریک کا تسلسل تھا جس نے حسینہ واجد کو اس کوٹہ سسٹم کو منسوخ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان مظاہروں میں بھی سینکڑوں نوجوانوں نے جان کی قربانی دے کر اپنے مطالبات منوائے تھے۔ اس تحریک کے دوران بنگلہ دیش ’سدھاروں چھاترا اودھیکر سونگرو کھون پریشد‘ (بنگلہ دیش جنرل سٹوڈنٹس رائٹ پروٹیکشن کونسل) ابھر کر سامنے آئی تھی۔ چھ سال بعد جب اسی کوٹے کو سپریم کورٹ کے ذریعے دوبارہ لاگو کرنے کی کوشش کی گئی تو بنگلہ دیشی طلبہ کے پاس نہ صرف تحریک کا تجربہ موجود تھا بلکہ ان چھ سالوں میں طلبہ نے کسی حد تک اپنی تنظیم اور قیادت بھی تخلیق کر لی تھی۔ اس بار تحریک کی قیادت ’اینٹی ڈسکریمینیشن سٹوڈنٹس موومنٹ‘ (تعصب و تفریق مخالف طلبہ تحریک) نامی 23 رکنی کوآرڈی نیٹرز کی کمیٹی کر رہی تھی جس کا قیام سپریم کورٹ کے مذکورہ فیصلے کے رد عمل میں ہوا اور جس میں ناہید اسلم اور آصف محمود بھی شامل تھے جو بعد ازاں اس تحریک کا چہرہ بن کر ابھرے اور موجودہ عبوری حکومت میں ایڈوائزر بھی ہیں۔ یہ دونوں 26 سالہ نوجوان ڈھاکہ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں اور دونوں ’گانو تنترک چھاترا شکتی‘ (ریپبلکن سٹوڈنٹس پاور) کے ڈھاکہ یونیورسٹی یونٹ کے جنرل سیکرٹری اور کنوینر ہیں۔ ’گانو تنترک چھاترا شکتی‘ بنیادی طور پر 2018ء میں کوٹہ موومنٹ کی قیادت کرنے والی ’سدھاروں چھاترا اودھیکر سونگرو کھون پریشد‘ سے علیحدہ ہوئی تنظیم ہے اور حالیہ تحریک کی مذکورہ 23 رکنی کمیٹی میں 9 نمائندے اسی تنظیم کے تھے۔ یہ تنظیم سنٹر لیفٹ ڈیموکریٹک نظریات رکھتی ہے اور اس کے علاوہ بھی اس کمیٹی میں جو بعد ازاں 32 رکنی سے بڑھ کر 159 رکنی ہو چکی ہے میں بائیں بازو کے نظریات رکھنے والی متعدد تنظیمیں شامل ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ہندوستانی ریاست نے تحریک سے خوفزدہ ہو کر اور سٹالنسٹ رجحانات نے تحریک سے باہر رہ جانے کے غم میں اپنی جہالت کا مظاہرہ کرتے ہوئے احتجاجی طلبہ کے خلاف انتہائی غلیظ اور زہریلا پراپیگنڈہ کیا۔ دونوں نے اپنی پوری طاقت سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس تحریک پر بنیاد پرست تنظیمیں خاص طور پر بنگلہ دیش کی کالعدم جماعت اسلامی کا قبضہ ہے اور بنگلہ دیش آنے والے دنوں میں افغانستان بننے جا رہا ہے۔ پاکستانی ریاست اور یہاں کی جماعت اسلامی کے پراپیگنڈہ نے بھی اس تاثر کو تقویت دی۔ یہ بات درست ہے کہ تحریک کے دوران حسینہ واجد کے بھاگ جانے کے بعد ایک وقت ایسا ضرور آیا تھا جب غیر یقینی صورتحال کا فائدہ اٹھا

کر بنیاد پرستوں نے تحریک آزادی کی یادگاروں اور شیخ مجیب الرحمان سمیت دیگر آزادی کے ہیروز کے مجسموں کو نقصان پہنچایا اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ مندروں پر حملہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ لیکن انتہائی پھرتی کے ساتھ تحریک کی قیادت نے فوراً ملک بھر میں کمیٹیاں تشکیل دے کر سکیورٹی کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کے بعد کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہی وہ وقت تھا جب سوشل میڈیا پر تحریک کی فتح کے بعد نوجوان طلبا و طالبات کی جانب سے ٹریفک کا نظام سنبھالنے کی ویڈیوز وائرل ہوئیں اور خطے کے نوجوانوں کے لیے گھٹن کے ماحول میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بنیں۔ کسی حد رمزی ہی سہی لیکن ان ویڈیوز کا تاثر اپنے اندر بہت اہمیت رکھتا تھا کہ اس متروک نظام کی چکی میں مسلسل پسنے والے ان نوجوانوں کو اگر موقع دیا جائے تو ان میں اتنی شکتی اور حوصلہ ہے کہ یہ اس موت بانٹتے سیارے پر زندگی کی بہار پیدا کر کے دکھا دیں گے۔ اور ماتم ہی کیا جا سکتا ہے اس عقل پر جو ایک ایسی تحریک میں رجعت تلاشتی ہے یا یہ سمجھتی ہے کہ جماعت اسلامی جیسی فسطائی قوتیں ایسی تحریک میں پنپ سکتی ہیں جس میں خواتین کی اتنی بڑی تعداد فرنٹ لائنز پر لڑ رہی ہو۔

اس بات کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اگرچہ 1971ء میں بنگلہ دیش کی تحریک سوشلسٹ انقلاب تک کا سفر طے نہ کر سکی جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان سے آزاد ہونے کی پانچ دہائیوں کے بعد بھی محنت کش طبقے کی زندگی کی تلخی میں کوئی کمی نہیں آئی اور شاید کئی حوالوں سے حالات پہلے سے بدتر ہو چکے ہیں۔ لیکن اس ادھورے پن میں بھی اس تحریک کی بہت ساری سیاسی و نظریاتی حاصلات اور اسباق ہیں جن میں بنیاد پرستی کی کمر ٹوٹ جانا اور لسانی و قومی حوالے سے کسی حد تک ایک یکجا قوم پر مبنی ریاست کی تشکیل شامل ہے۔ اگرچہ تحریک آزادی کی روایتی پارٹی عوامی لیگ کے اس عبرت ناک انجام کے بعد بی این پی جو کہ ایک سنٹر رائٹ جماعت ہے اور بنیاد پرستی میں اپنی جڑیں رکھتی ہے کے لیے بھی مواقع کی کھڑکی کھلی ہے لیکن بنیاد پرستی کے بنگلہ دیشی سماج پر حاوی ہو جانے کے امکانات کم از کم فی الوقت ناپید ہیں۔ بنیاد پرستی کا حاوی ہونا تو درکنار تحریک کی موجودہ کیفیت میں تو بی این پی کا اقتدار حاصل کرنا بھی اتنا آسان نہیں ہو گا۔ کابینہ میں موجود تحریک کے دونوں رہنماؤں نے یہ واضح کیا ہے کہ اگرچہ اس عبوری حکومت کا کام الیکشن کرا کے اقتدار منتقل کرنا ہے لیکن ہم نہیں چاہتے کہ ریاست اور خاص طور پر الیکشن کمیشن میں ایسی سٹرکچرل اصلاحات سے پہلے الیکشن کرائے جائیں جن کے ذریعے فسطائیت یا آمریت کا راستہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روکا جا سکے۔ دوسری طرف طلبہ تحریک اور اس کی قیادت یہ چاہتی ہے کہ الیکشن سے پہلے انہیں کچھ وقت مل جائے تاکہ وہ پارٹی بنا لیں جس کی سرتوڑ کوششیں بھی جاری ہیں۔ یہ طلبہ اگر معقول مطالبات، پروگرام اور حکمت عملی کے ذریعے محنت کش طبقے کو بھی اپنے ساتھ جوڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو آئندہ انتخابات غیر معمولی نتائج اور مضمرات کے حامل ہوں گے۔ لیکن اس کے امکانات بہت زیادہ نظر نہیں آ رہے ہیں۔

طلبہ اپنی حدت اور شورش سے محنت کش طبقے کے اندر تحرک تو پیدا کر سکتے ہیں لیکن اس سے آگے کے مراحل میں کسی

خاطر خواہ انقلابی پیش رفت کے لیے پھر محنت کش طبقے کا ہراول کردار ضروری ہو جاتا ہے۔ حالیہ تحریک میں محنت کش کسی حد تک شامل تو ضرور ہوئے لیکن بحیثیت طبقہ یا سیاسی فارمیشن کے نہیں بلکہ عوام کی صورت میں۔ بہرحال ایک نئی پارٹی تو ہر دو صورتوں میں ضرور بنے گی لیکن صرف طلبہ پر مشتمل اگر کوئی پارٹی بنتی ہے تو اس کی اپنی محدودیت رہے گی۔

تحریک کے خلاف ایک اور بیہودہ پراپیگنڈہ یہ کیا جا رہا ہے کہ چونکہ طلبہ نے ڈاکٹر یونس کو بلا کر عبوری حکومت کا چیف ایڈوائزر بنوایا ہے جو مغربی سامراج اور عالمی مالیاتی بیوروکریسی کا منظور نظر ہے اور دوسری طرف حسینہ واجد یہ کہہ رہی ہے کہ امریکہ کو 'ایبسلوٹلی ناٹ' کہنے پر مجھے سازش کے ذریعے نکالا گیا ہے لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس ساری تحریک کے پیچھے سی آئی اے کا ہاتھ تھا۔ سی آئی اے تو کیا دنیا میں کوئی بھی سامراجی طاقت مصنوعی بنیادوں، طریقوں یا سازش کے ذریعے ایسی تحریکیں برپا نہیں کر سکتی جن میں لاکھوں نوجوان شامل ہوں اور تحریک کی خاطر سینکڑوں کی تعداد میں جانوں کا نذرانہ پیش کر دیں۔ تحریکیں موضوعی عناصر کی مرضی اور ان کے ذہن میں موجود خاکوں کے عین مطابق نہیں ابھرتیں۔ بالخصوص تحریکوں کے ابھار یا شروعات کے حوالے سے موضوعی یا ''بیرونی'' عناصر (چاہے رجعتی ہوں یا انقلابی) زیادہ سے زیادہ پہلے سے جاری معروضی عوامل کو جزوی مہمیز یا تقویت ہی دے سکتے ہیں۔ مزید برآں بالفرض کسی سامراجی یا داخلی رجعتی رجحان کے مفادات وقتی طور پر کسی عوامی تحریک سے میل کھاتے ہیں تو اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہوتا کہ تحریک ان کی مرضی یا ایما سے چل رہی ہے۔

سماج کے اپنے ارتقا کے دوران طبقاتی کشمکش اور فوری واقعات کے زیر اثر تحریک کے ابھرنے، پسپا ہونے یا آگے بڑھ جانے میں موضوعی عنصر کے علاوہ کئی اور محرکات بھی شامل ہوتے ہیں جس کے باعث تحریکوں کی ایک آزادانہ حرکت بھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعی عنصر کی مکمل غیر موجودگی میں بھی تحریکیں ابھرتی ہیں اور انتہائی ٹھوس موضوعی عنصر کے ہوتے ہوئے بھی بعض اوقات تحریکیں برپا نہیں ہو پاتیں۔ خالصتاً انقلابی تحریک دانشور دماغوں میں ہی وجود رکھتی ہے۔ اس لیے انقلابیوں کا یہ کام نہیں ہے کہ جو تحریکیں ان کی خواہشات کے تابع نہ ہوں ان پر فتوے بازی کرتے پھریں بلکہ ان کے سامنے ہمیشہ یہ سوال ہونا چاہیے کہ ان میں مداخلت کر کے انہیں انقلابی عمل کی طرف موڑا کیسے جائے اور اپنی قوتوں اور اثر و رسوخ میں اضافہ کیسے کیا جائے۔

بنگلہ دیش کی حالیہ تحریک' طلبہ تک ہی محدود ہو جانے سے فی الوقت پیٹی بورژوا جمہوری امنگوں سے آگے نہیں بڑھ پائی۔ اس کا واضح اظہار طلبہ کی طرف سے ڈاکٹر یونس جیسے نوسرباز اور نیولبرل سامراجی گماشتے کو عبوری حکومت کا چیف ایڈوائزر بنانے کے مطالبے میں بھی ہوتا ہے۔ وہ ایک بینکار

بنگلہ دیش کی حالیہ تحریک' طلبہ تک ہی محدود ہو جانے سے فی الوقت پیٹی بورژوا جمہوری امنگوں سے آگے نہیں بڑھ پائی۔ اس کا واضح اظہار طلبہ کی طرف سے ڈاکٹر یونس جیسے نوسرباز اور نیولبرل سامراجی گماشتے کو عبوری حکومت کا چیف ایڈوائزر بنانے کے مطالبے میں بھی ہوتا ہے۔

ہے جسے مائیکروفنانسنگ کے ذریعے غربت مٹانے کی ایسی پالیسی پر نوبل انعام دیا گیا تھا جو درحقیقت ایک فراڈ تھا۔ المیہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش کی حالیہ صورتحال خود ڈاکٹر یونس کی پالیسیوں کی ناکامی کا واضح ثبوت ہے۔ لیکن پیٹی بورژوازی سے تعلق رکھنے والے طلبہ (بالخصوص یونیورسٹیوں تک پہنچ سکنے والے) ایسی نسبتاً مراعت یافتہ سماجی پرت سے تعلق رکھتے ہیں جن کے شعور پر ڈاکٹر یونس یا عبدالستار ایدھی یا دوسری ایسی اصلاح پسند شخصیات اور رجحانات، جنہیں حکمران طبقات تعلیمی نصابوں اور میڈیا کے ذریعے خوب ابھارتے ہیں، ایک بوجھ کی طرح سوار ہوتے ہیں۔ بالخصوص ایسے حالات میں جب محنت کش طبقہ مجہول ہو یا سیاسی و نظریاتی کمزوریوں سے دوچار ہو۔ اگرچہ ناہید اسلم اور دیگر طلبہ پرعزم ہیں کہ وہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے عوام دوست جمہوری اور معاشی اصلاحات کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن وقتی کامیابیوں کے باوجود یہ آئیڈیلزم آج نہیں تو کل ناگزیر طور پر تلخ مادی حقائق سے ٹکرائے گا۔ سامراجی و مقامی حکمران فی الوقت پسپا ہوئے ہیں۔ لیکن لمبے عرصے میں وہ طلبہ کو بغاوت کی سزا دینے کا کوئی موقع گنوائیں گے نہیں۔ ان گنت قربانیوں سے قومی آزادی حاصل کرنے کے باوجود بنگلہ دیش میں بھی ایک سرمایہ دارانہ ریاست اقتدار پر قابض ہے۔ جس کا کردار جبر و تشدد کے ذریعے طبقاتی استحصال کے نظام کو قائم رکھنا ہی ہے۔ ان حالات میں اس نظام کی زوال پذیری کی حقیقتیں اور حکمرانوں کی انتہائی پرفریب مکاریاں زیادہ واضح ہو کے سامنے آئیں گی اور سب سے پہلے طلبہ کی زیادہ باشعور پرتوں کے سامنے یہ عیاں کریں گی کہ کسی انسان دوست سرمایہ داری کی گنجائش اس زمان و مکاں میں موجود نہیں ہے۔ یہ نظام ایک بہت چھوٹی سی مراعت یافتہ اقلیت کے علاوہ باقی انسانوں میں غربت، موت، جبر اور ذلت ہی بانٹ سکتا ہے۔

بنگلہ دیش کی عمومی معاشی کیفیت مسلسل گراوٹ کا شکار ہے۔ آئی ایم ایف پروگرام، نجکاری، کٹوتیوں، بجلی کی قیمتوں میں اضافے، بیروزگاری، مہنگائی، سکڑتی اجرتوں اور کام کرنے کے انتہائی برے حالات کے خلاف محنت کش طبقے کے اندر ایک تحریک پک رہی ہے جو گاہے بگاہے چھوٹے بڑے احتجاجوں اور ہڑتالوں میں اپنا اظہار بھی کرتی نظر آتی ہے۔ طلبہ کی حالیہ تحریک جہاں بنگلہ دیش کے اندر اور باہر آنے والی تحریکوں کے لیے اپنے اسباق چھوڑ جائے گی وہاں ناگزیر طور پر محنت کش طبقے کے تاریخ کے میدانِ عمل میں اترنے کی پیش رفت کو بھی مہمیز دے گی۔ جب دنیا کی نصف سے زائد ٹیکسٹائل مصنوعات پیدا کرنے والا بنگلہ دیش کا دیوہیکل پرولتاریہ پیش قدمی کرے گا تو نہ صرف جنوب ایشیا بلکہ ساری دنیا کا منظرنامہ بدل کے رکھ دے گا۔

طلبہ احتجاج: ان کے غصے میں خوشبو بغاوت کی ہے!

تحریر: اویس قرنی

ماہ اکتوبر کے وسط سے لاہور کے پنجاب کالج سے پھوٹنے والے طلبہ مظاہرے، جو کئی شہروں تک پھیل گئے، درحقیقت سماجی سطح کے نیچے پلنے والی نفرت، غصے اور مسلسل عدم اطمینان کا اظہار تھے۔ ان مظاہروں کی شدت اور ان میں شریک کالج کے طلبا و طالبات پر ہونے والی بدترین پولیس گردی نے اس بحث کو بے معنی بنا دیا ہے کہ مظاہروں کا موجب بننے والے مبینہ زیادتی کے واقعے کی حقیقت کیا ہے۔ پنجاب گروپ آف کالجز تعلیم کے دھندے میں ایک ٹائیکون کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ریاست نے اس منافع بخش سرمایہ کاری کی حفاظت کی خاطر انٹرمیڈیٹ کے معصوم بچوں پر ایسی یلغار کی کہ لاہور، راولپنڈی اور گجرات جیسے شہروں کی شاہراہیں جنگی محاذ کا منظر پیش کرتی رہیں۔ ایک طرف نہتے بچے، بالخصوص بچیاں تھی۔ دوسری جانب لاٹھیوں، بندوقوں، بکتر بند گاڑیوں اور ان گنت آنسو گیس کے شیلوں سے مسلح ریاستی اہلکار۔ سولہ سترہ سال کے بچوں پر بدترین تشدد کے علاوہ سینکڑوں کو گرفتار بھی کیا گیا۔ لیکن ان بے باک مظاہروں نے اس نسل سے متعلق تمام مغالطوں کے پہاڑوں کو زمیں بوس کر دیا اور اس دعوے پر مہر تصدیق ثبت کی کہ نئی نسل جبر و استحصال پر مبنی اس نظام کے لیے ماضی سے کہیں بڑا چیلنج ہے۔

نوجوانوں کی اس محدود لیکن دلیرانہ لڑائی کا کئی زاویوں سے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اور پھر اس بات کا بھی گہرائی میں مشاہدہ درکار ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس عہد میں کس طرح نوجوانوں کی اس دیوہیکل شکتی کو حکمران دھڑوں کے مختلف رجحانات اپنی داخلی لڑائیوں، عدم استحکام اور انتشار کی جانب دھکیلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ حالیہ مظاہروں کو تحریک انصاف کی رجعتی سوشل میڈیا مشینری اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتی نظر آئی۔ شخصیت پرستی اور نرگسیت پر مبنی ایسے رجحانات اس قدر سفاک ہوتے ہیں کہ اپنے گھٹیا اور معمولی قسم کے عزائم کے لیے معصوم بچوں کی بھینٹ چڑھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

حالیہ مظاہروں میں سب سے بنیادی سوال یا نکتہ یہ ہے کہ جنسی تشدد اور ہراسانی کو اس بحران زدہ سرمایہ داری نے ایک سماجی معمول بنا دیا ہے تو پھر ایک اور واقعہ، جس کے بظاہر شواہد بھی موجود نہیں، بدترین ریاستی خوف اور جبر کے ماحول کے باوجود نوجوانوں کو اس قدر بڑے پیمانے پر احتجاج کرنے پر کیسے آمادہ کر سکتا ہے؟ مروجہ سوچ یا رسمی منطق کے حساب سے یہ ایک بچگانہ عمل ہے جس کی کوئی ضرورت یا جواز نہیں بنتا تھا۔ لیکن محنت کش عوام کی نسبتاً بے عملی کے بظاہر شانت اور غیر انقلابی وقتوں میں بھی سماج کی بالائی تہہ کے نیچے مسلسل لاوا پک رہا ہوتا ہے۔ جبر، پابندیوں اور محرومیوں کے خلاف حقارت اور نفرت کی شدت بڑھتی جاتی ہے۔ جسے کوئی بہانہ، کوئی موقع چاہیے ہوتا ہے۔ یہ لاوا جب پھٹ پڑتا ہے تو عام حالات میں جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا جرم بنا دیا گیا ہوتا ہے، لوگ اسے بھسم کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ ان ایوانوں کو آگ لگا دیتے ہیں جہاں ان کی شنوائی نہیں ہوتی۔ استحصالی سرمایہ داری نظام کی علامت سمجھے جانے والے بینکوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس نظام کی پولیسنگ کرنے والوں پر زمین تنگ کر دیتے ہیں۔ طلبہ کے حالیہ مظاہروں میں اسی کیفیت کی جھلک نظر آئی ہے۔ طلبا و طالبات نے سب سے پہلے ان کیمپس عمارات کو نقصان پہنچایا جو دراصل جیلوں سے کم نہیں ہیں۔ ان بسوں کو جلایا گیا جن میں عام حالات میں انہیں فیس دینے کے باوجود سیٹ نہیں ملتی۔ ان سکیورٹی گارڈز کو غیض و غضب کا نشانہ بنایا گیا جو انتظامیہ کی ایما پر ان کی ہر روز تذلیل کرتے ہیں اور تعلیمی اداروں میں ریاستی دھونس کی علامت بن چکے ہیں۔

ان مظاہروں کی سب سے خاص بات طلبہ کا نجی تعلیمی اداروں کی دھونس اور بدمعاشی کو سہتے رہنے سے انکار تھا۔ آج تمام نجی تعلیمی ادارے، بالخصوص کالجز باقاعدہ جیل خانہ جات کی طرز پر چلائے جا رہے ہیں۔ بیشتر نجی یونیورسٹیوں کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ ادارے کے مرکزی گیٹ میں سے داخل ہونے کے بعد ہر نوجوان ایک نفسیاتی ہیجان اور خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کہاں اور کیسے کھڑا ہونا ہے؟ بیٹھنا کیسے اور کہاں ہے؟ کس سے اور کیا بات کرنی ہے؟ کیا پہننا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہر لمحہ نوجوان خود کو ایک جعلی اور رجعتی ڈسپلن کا پابند اور قیدی محسوس کرتے ہیں۔ آزادی سے سانس لینا تک دشوار ہے۔ سوچوں پر پہرے ہیں۔ کلاس روموں کے اندر اور باہر، ہر جگہ تذلیل ہے۔ بھاری بھرکم فیسیں ہیں لیکن مستقبل تاریک۔ یہ مظاہرے نجی تعلیمی اداروں کی اسی جابرانہ روش کے خلاف ایک انتباہ تھے۔ جنہوں نے واضح کیا ہے کہ نجی تعلیم حاصل کرنے والے نسبتاً مراعت یافتہ نوجوان بھی بغاوت پر اتر سکتے ہیں اور لڑنے مرنے کی حد تک جا سکتے ہیں۔

تاریخ بڑی ستم ظریف ہے۔ منافعوں کے حصول کے لیے ملک بھر میں پنجاب گروپ آف کالجز کے بچھائے ہوئے جال نے ہی ان احتجاجوں کی وسعت اور پھیلاؤ میں اہم کردار

ماہ اکتوبر کے وسط سے لاہور کے پنجاب کالج سے پھوٹنے والے طلبہ مظاہرے، جو کئی شہروں تک پھیل گئے، درحقیقت سماجی سطح کے نیچے پلنے والی نفرت، غصے اور مسلسل عدم اطمینان کا اظہار تھے۔

ادا کیا۔ اس ''گروپ آف کالجز'' کی بدنام زمانہ انتظامیہ نے ہمیشہ دھونس اور بدمعاشی کو طلبہ کو کنٹرول کرنے کا کلیہ بنایا۔ لیکن پھر طلبہ کے اندر مسلسل مجتمع ہوتے جانے والے غم و غصے کے پریشر نے پھٹ کر ان کی ساری رعونت پر خاک ڈال دی۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ آج کے نوجوان کو رائج الوقت سیاست، حکومت اور ریاست پر کوئی اعتبار نہیں ہے۔ جب سے ان نوجوانوں نے ہوش سنبھالا ہے' جو سیاسی و ریاستی کھلواڑ جاری ہے اس کے ہوتے کوئی اعتماد بن بھی کیسے سکتا ہے؟ اس پولیس کی پریس بریفنگ یا تحقیقات پر بھلا کون یقین کر سکتا ہے جو روازنہ کی بنیاد پر بدعنوانی، بھتہ خوری اور سیاسی کاسہ لیسی کی نئی مثالیں قائم کرتی ہو۔ یہی کیفیت حکومتوں کی بھی ہے۔ مبینہ ریپ کے واقعے کے تناظر میں بھی خود وزیر اعلیٰ پنجاب اور ان کی حکومت کے نمائندوں کے بیانات میں تضادات موجود تھے۔ جن کی وجہ سے حکومت کی رہی سہی ساکھ بھی خاک میں مل گئی اور ایک بڑی اکثریت نے حکومتی موقف کو یکسر مسترد کر دیا۔

سرمایہ داری کے بڑھتے بحران کے ساتھ بالخصوص پاکستان اور انڈیا جیسے معاشروں میں جنسی ہراسانی اور بلادکار جیسے قبیح رجحانات ایک زہر کی طرح سماج کے رگ و پے میں سرایت کر گئے ہیں۔ حکمران اشرافیہ اور ان کی ریاستوں کے رجعت اور ڈھٹائی پر مبنی رویوں نے اس وحشت کو ایک تسلیم شدہ معمول بنا دیا ہے۔ روزانہ کی بنیاد پر ایسے واقعات کی بھرمار ہے۔ لیکن کبھی وزرائے اعظم اور اعلیٰ حکومتی عہدیدار وکٹم بلیمنگ کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی کوئی لوکل یا امپورٹڈ مولوی مین سٹریم میڈیا پر ہراسانی اور جنسی زیادتیوں کا ذمہ دار خود خواتین، ان کے پہناوے اور بعض صورتوں میں محض ان کے وجود کو قرار دے رہا ہوتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں، نوجوان لڑکے اور لاشیں تک اس درندگی سے محفوظ نہیں۔

پھر ایسے فسطائی رجحانات بھی ہیں جو ہراسانی کے معاملے کو ''بیہودگی'' اور پردے کیساتھ جوڑ کے بچیوں کی تعلیم کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ڈِسکو قسم کے مولوی سوشل میڈیا پر گانوں وغیرہ کے ذریعے خواتین کی تعلیم کے خلاف ذہنوں میں گند انڈیل رہے ہیں اور ریاست خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ یہ جنونی عناصر بچیوں سے تعلیم کا حق ہی چھین لینے کے درپے ہیں۔ حالانکہ مدرسوں کے اندر کئی گنا بڑے اور شدید جنسی جرائم کا بازار گرم ہے۔ یہاں انٹرنیٹ فائر وال بنا کر سیاسی مخالفوں کی زبان بندی کے پورے پورے ڈیپارٹمنٹ بنا دیے گئے ہیں لیکن ایسے جنونیوں کو کھلی چھٹی حاصل ہے۔

بہرحال حالیہ واقعہ کے ابہام کے باوجود تعلیمی اداروں میں یہ مسئلہ شدت سے موجود ہے تو طلبہ اس کرب کو محسوس کر کے سڑکوں پر آئے ہیں۔ ماضی قریب میں بھی ہراسانی کے واقعات پر انکوائری رپورٹوں کے احکامات صادر ہوئے لیکن آج تک ان کے نتائج کو منظر عام پر نہیں لایا گیا۔

بلوچستان یونیورسٹی ہو، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور یا پھر مالاکنڈ یونیورسٹی' سب جگہ معاملہ دبا دیا گیا۔

اس بات کا ادراک بھی ضروری ہے کہ جنسی تشدد و ہراسانی کوئی ذاتی یا انفرادی نوعیت کا عارضہ نہیں بلکہ ایک معاشرتی مظہر ہے اور اب استحصال اور جبر پر مبنی اس نظامِ تعلیم میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ طلبہ جو اس شعبہ کی بنیاد ہیں' ان کا کردار محض فیسوں کی ادائیگی تک مقید کرتے کرتے' انہیں ادارہ جاتی پالیسیوں اور تعلیمی نظام کی تشکیل کے عمل سے یکسر کاٹ دیا گیا ہے۔ طلبہ یونین پر ضیا آمریت کی لگائی پابندی آج تک بدستور قائم ہے۔ بلکہ آج کی تمام مین سٹریم سیاسی پارٹیوں کے دورِ اقتدار میں اس قدغن کو سخت ہی کیا گیا ہے۔ سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے اپنا ''ترقی پسندی'' کا امیج بنانے کے لیے جوش میں طلبہ یونین بحالی کی بات تو کی لیکن کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔

تعلیمی اداروں میں ایسے مسائل کے خلاف جدوجہد این جی اوز کے نسخوں یا حکومتی ٹریننگ اور ورکشاپوں وغیرہ کے ذریعے ممکن نہیں۔ محض قانون سازیوں سے بھی بات بننے والی نہیں۔ بلکہ تعلیمی اداروں کی عملداری اور فیصلہ سازی میں طلبہ کی فعال شمولیت کے ذریعے سے ہی کوئی بہتری لائی جا سکتی ہے۔ حکمرانوں کے جھانسے میں آئے بغیر جمہوری انداز سے منتخب طلبہ کی ہراسانی مخالف کمیٹیوں کی تشکیل اور ادارے کے معاملات میں اپنی آواز اٹھانے کا حق حاصل کرنے کی جدوجہد اس جانب ایک اہم قدم ثابت ہو سکتا ہے۔

حالیہ خود رو مظاہروں نے یقیناً گہرے سماجی عدم اطمینان کی کیفیت کو آشکار کیا ہے لیکن خود رو تحریکوں کی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ زماں و مکاں میں اپنی محدودیت کے باوجود یہ پیش رفت نہایت خوش آئند اور متاثر کن ہے۔ فی الوقت یہ مظاہرے تھمتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہر تحریک اپنے منطقی انجام تک نہیں پہنچتی۔ یہ پشیمانی یا پریشانی کا باعث نہیں ہونا چاہیے کہ پیٹی بورژوا بے صبرے پن میں ''واردات'' کے ذریعے تحریکیں چلانے یا ان پر سوار ہونے کی کوشش کی جائے۔ انقلاب کے نام پر کی جانے والی ایسی مکاری اور عیاری کو لوگ کبھی نہیں بھولتے۔ انقلاب ایک صبر آزما کام ہے جو دیانتداری اور سچائی کا متقاضی ہوتا ہے۔ نامکمل تحریکیں بھی آنے والی بغاوتوں کے لیے اہم اسباق چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ ادراک نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ جن مسائل کے خلاف غصے اور نفرت کو حالیہ طلبہ احتجاجوں میں اپنے اظہار کا موقع ملا ہے ان کا اس بوسیدہ استحصالی نظام میں خاتمہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہ شورش دوبارہ بھڑکے گی اور زیادہ شدت کے ساتھ بھڑکے گی۔ ایسے حالات کی تیاری کی ذمہ داری انقلابیوں پر عائد ہوتی ہے۔

پوری دنیا میں سرمایہ داری کو نہ صرف بحرانات کا سامنا ہے بلکہ طلبہ و محنت کشوں کی مسلسل تحریکیں بھی ہر طرف ابھر رہی ہیں۔ عامیانہ اور قدامت پرستانہ سوچ آئی ٹی انقلاب اور سوشل میڈیا کے عہد کی نئی نسل پر ہمیشہ طعنہ زن رہی ہے۔ لیکن سامراجی ریاست کے گڑھ میں ابھرنے والے ان احتجاجوں نے مستقبل کے امکانات بالکل واضح کر دیئے ہیں۔ یہ نسل اپنے سے پہلے والوں سے زیادہ محرومی اور نفسیاتی ہیجان کا شکار ہے۔ مسلسل انتشار اور بحرانات میں پلنے والے یہ نوجوان شدید غیر یقینی سے دوچار ہیں۔ لیکن ان کی لڑائی طبقاتی جدوجہد کے نصب العین اور مقاصد سے ہی ہم آہنگ ہے۔ اسرائیلی جارحیت کے خلاف عالمگیر تحریک سے لے کے لبنان، چلی، سری لنکا، سوڈان اور بنگلہ دیش میں ہونے والی بغاوتیں نئی نسل کی انقلابی صلاحیتوں کی گواہ بنی ہیں۔ مزدور تحریک کی انقلابی اٹھان کے ساتھ نوجوان طلبہ کی جرأت وقت کا دھارا موڑ کے رکھ سکتی ہے۔

وادی سوات: تین روزہ یوتھ مارکسی سکول 2024ء کا انعقاد

آر ایس ایف پختونخواہ

ریولوشنری سٹوڈنٹس فرنٹ (آر ایس ایف) اور جموں کشمیر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن (جے کے این ایس ایف) کے زیر انتظام وادی سوات میں تین روزہ یوتھ مارکسی سکول کا انعقاد کیا گیا۔ موسم گرما 2024ء کا یہ مارکسی سکول 23 تا 25 اگست کو منعقد کیا گیا۔ ماضی قریب اور حال میں عظیم مزاحمتی اور انقلابی روایات کی حامل اس سرزمین کو بنیاد پرستی کے اندھیروں میں غرق کرنے کی بھرپور سامراجی کوششیں کی گئی ہیں لیکن اس جنت نظیر وادی میں سینکڑوں

انقلابی نوجوانوں کا یہ جرات مندانہ اکٹھ جہد مسلسل اور روشن مستقبل کی نوید بنا ہے۔

انتہائی نامساعد سیاسی و معاشی حالات میں بھی سکول میں شرکت کے لئے ملک بھر اور اس کے زیر انتظام علاقوں سے سینکڑوں نوجوان 22 اگست کی شام کو مالم جبہ پہنچے جہاں آر ایس ایف پختون خواہ کی میزبان کمیٹی نے ان کا استقبال کیا۔ مارکسی سکول میں 50 خواتین سمیت 350 سے زائد انقلابی نوجوانوں نے شرکت کی۔ سکول میں بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن (بی ایس او) اور پروگریسو سٹوڈنٹس کلیکٹو (پی ایس سی) سمیت دیگر دوست تنظیموں کے وفود نے بھی شرکت کی۔ تین روزہ مارکسی سکول کے دوران مجموعی طور پر چار بنیادی موضوعات پر بحث کے علاوہ ثقافتی و ادبی سرگرمیوں کا انعقاد بھی کیا گیا۔

23 اگست بروز جمعہ کی صبح ناشتہ کے بعد سکول میں شرکت کے لئے آنے والے تمام انقلابی نوجوان پہلے سیشن میں شمولیت کے لئے ہال میں جمع ہوئے۔ مارکسی سکول کے طے شدہ موضوعات پر بحث کے باضابطہ آغاز سے قبل خطے میں بنیاد پرستی، سامراجیت اور سرمایہ داری کے خلاف مزاحمت اور جدوجہد کی بے باک عوامی آواز، سابقہ منتخب ناظم ضلع مالاکنڈ اور پاکستان ٹریڈ یونین ڈیفنس کمپئین کے سینئر نائب صدر ایڈوکیٹ غفران احد نے ملک کے طول و عرض سے آنے والے نوجوان ساتھیوں کو خوش آمدید کہا اور سکول کے انتظامات و ڈسپلن کے بارے میں آگاہ کیا۔

ابتدائی کلمات کے بعد سکول کے مجموعی طور پر پہلے سیشن پر بحث کا باضابطہ آغاز کر دیا گیا۔ پہلے سیشن کو خکلہ باچا نے چیئر کیا۔ اس سیشن کے موضوع ''ہنگامہ خیز دنیا: سرمایہ داری کا کثیر الجہتی بحران اور انقلابی حل'' پر چیئرمین جے کے این ایس ایف ضلع پونچھ کامریڈ مجیب خان نے تفصیل سے روشنی ڈالی اور دنیا بھر میں سرمایہ داری کے شدت پکڑتے تضادات، بحرانات اور تحریکوں کی موجودہ صورتحال اور تناظر پر بات رکھی۔ سیشن کی لیڈ آف اور کنٹری بیوشنز میں سرمایہ داری کے معاشی بحران کی نوعیت، عالمی معیشت کے جائزے، مغربی سرمایہ داری کے بحران اور امریکی سامراج کے زوال، چین کے ابھار اور اس کی معیشت اور ریاست کی نوعیت، جغرافیائی و سیاسی معاشی بین السامراجی لڑائیوں، یوکرائن اور غزہ میں جنگوں، ماحولیاتی بحران اور گلوبل وارمنگ، سیاسی پولرائزیشن اور بائیں اور دائیں پاپولزم کے ابھرتے ہوئے دھاروں، انتہائی دائیں بازو اور مذہبی بنیاد پرستی کی نئی شکلوں، تارکین وطن اور ہجرت کے بحران، عصری دنیا میں ہڑتالوں، عوامی تحریکوں اور بغاوتوں، سلگتے ہوئے قومی سوال اور قومی آزادی کی تحریکوں، افریقہ میں فوجی بغاوتوں، فرانس، برطانیہ، بھارت اور وینزویلا میں انتخابات، بنگلہ دیش میں طلبہ کی جفاکش تحریک، پاکستانی سرمایہ داری کے وجودی بحران اور جنوب ایشیا میں حالیہ پیش رفتوں کا عمومی تجزیہ کیا گیا۔ لیڈ آف کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا جو سیشن کے آخر تک جاری رہا۔ اس بحث میں حصہ لینے والوں میں عروج امجد، ایڈوکیٹ یاسر رسول، ممتاز آر یسر، ثناءِ محمد، امن حبیب، اسلام شفیق، علی رضا، جیئند بلوچ اور عمران کامیانہ شامل تھے جنہوں نے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے مستقبل کے مختلف امکانات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ آخر میں مجیب خان نے بحث کو سمیٹتے ہوئے سکول کے پہلے سیشن کا

باضابطہ اختتام کیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد جمعہ کے روز ہی تین بجے سکول کے دوسرے سیشن کا باضابطہ آغاز کیا گیا۔ پہلے روز کے دوسرے سیشن ''مارکسی نقطہ نظر سے عصری سرمایہ داری کا سماجی وثقافتی تجزیہ'' کے موضوع پر بحث کی گئی جبکہ اس سیشن میں چیئر کے فرائض ایڈووکیٹ ایاز ٹیپو نے ادا کیے۔ اویس قرنی نے اپنی لیڈ آف میں مارکس کا فلسفہ بیگانگی، استصنام اشیا (Commodity Fetishism)، کنزیومرازم، منڈی کی نفسیات، بورژوا خاندان کے بحران، ترقی کے ناہموار اور مشترک پیٹرن والے معاشروں کے سماجی بحران، نسل پرستی، مذہبی بنیاد پرستی اور دہشت گردی، جرائم اور منشیات کی لت، جنسی تشدد، سوشل میڈیا اور وائرل ہونے کی نفسیات کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو رکھی۔ جس کے بعد خکلہ باچا، ساشا جاوید، عابد بزدار، انعم اختر، التمش تصدق، صائمہ بتول، فیضان طارق اور ثناء محمد نے بحث کو آگے بڑھایا اور آخر میں عمران کامیانہ نے سوالات کی روشنی میں تمام تر بحث کو سمیٹتے ہوئے سیشن کا باضابطہ اختتام کیا۔

سکول کے دوسرے روز 24 اگست کی صبح بعد از ناشتہ مجموعی طور پر سکول کے تیسرے اور دوسرے روز کے واحد سیشن پر بحث کا آغاز کیا گیا۔ ''بعد از عالمی جنگ کے انقلابات، عوامی بغاوتیں اور انقلابی دھڑن تختوں کی تاریخ اور اسباق'' کے موضوع پر کامریڈ عمران کامیانہ نے تفصیلی لیڈ آف دی جبکہ ممتاز آریسر نے سیشن کو چیئر کیا۔ عمران کامیانہ نے پرولتاری بوناپارٹزم، انحطاط شدہ اور مسخ شدہ مزدور ریاستوں، چین، کیوبا، ویتنام، افغانستان وغیرہ کے انقلابات، خطہ عرب اور افریقہ میں بائیں بازو کی فوجی بغاوتوں، 60ء اور 70ء کی دہائیوں میں دنیا بھر میں ہونے والے عوامی احتجاجات، ہڑتالوں اور 1968ء کی انقلابی تحریکوں، عرب دنیا میں بعث پارٹی اور بائیں بازو کی قوم پرستی کے رجحانات اور ماضی کے ان واقعات کی روشنی میں مستقبل کے تناظر کو موضوع بحث بنایا۔ لیڈ آف کے بعد مختلف سوالات کے ساتھ بحث کو آگے بڑھانے کے لئے کنٹری بیوشنز کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس سیر حاصل بحث میں آصف رشید، ساجد ایوب، ڈاکٹر بشیر احمد، علیزہ اسلم، دانش فدا، سعید احمد نے حصہ لیا۔ عمران کامیانہ نے آخر میں سوالات کی روشنی میں بحث کو سمیٹتے ہوئے سکول کے تیسرے سیشن کا باضابطہ اختتام کیا۔ اس دوران مختلف کامریڈز انقلابی ترانوں اور نظموں کے ذریعے سکول کے شرکا کا جوش بڑھاتے رہے۔

سکول کے دوسرے روز دوپہر کے کھانے کے بعد ملحقہ سرسبز میدان میں ٹریکنگ اور کھیلوں کی سرگرمیوں کا انعقاد کیا گیا۔ انقلابی نوجوانوں نے ٹولیوں کی شکل میں سیاحتی مقامات گرین ویلی اور مالم جبہ ٹاپ وغیرہ کی طرف سیر وتفریح کے لئے سفر بھی کیا۔

25 اگست بروز اتوار سکول کے تیسرے اور آخری روز ناشتے کے بعد مجموعی طور پر سکول کے چوتھے اور آخری سیشن کا انعقاد کیا گیا۔ ''موجودہ صورتحال میں انقلابی نوجوانوں کا کردار'' کے موضوع پر بحث کا آغاز عمر عبداللہ نے کرتے ہوئے قومی اور عالمی سطح پر نوجوانوں اور طلبہ کی سرکشیوں، موجودہ دور میں نوجوانوں کو درپیش چیلنجز اور مسائل، انقلابی تحریکوں اور انقلابی پارٹی کی تعمیر میں نوجوانوں کے کردار، طلبہ سیاست کے موجودہ حالات، بیروزگاری، بیگانگی اور تعلیمی نظام کے بحران وغیرہ جیسے نکات پر روشنی ڈالی۔ اس سیشن کو چیئر یاسر رسول نے کیا۔ اس سیشن میں تمام ریجنوں سے مختلف کامریڈوں نے اپنے اپنے خطے کی موجودہ صورتحال اور مستقبل کے لائحہ عمل اور اہداف پر تفصیلی رپورٹس بھی پیش کیں۔ اس کے بعد اوپن ڈسکشن کا سلسلہ شروع کیا گیا جس میں میزبان ریجن سے کامریڈ غفران احد نے سکول کی فنانس رپورٹ کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس تاریخی سکول کے کامیاب انعقاد پر تمام ساتھیوں کو مبارکباد پیش کی۔ اس کے علاوہ جموں کشمیر نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سابق مرکزی صدر راشد شیخ، راحیل، سقراط بلوچ، عاصمہ بتول، بی ایس او کے مرکزی چیئرمین جیئند بلوچ اور عمران کامیانہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں آر ایس ایف کے مرکزی آرگنائزر اویس قرنی نے سکول کے اختتامی کلمات ادا کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا کہ یہ سرگرمی سوشلسٹ انقلاب کے کٹھن سفر میں اہم سنگ میل ثابت ہوگی اور شرکا پورے خطے اور دنیا بھر میں انقلابی کام کو پوری جانفشانی سے آگے بڑھائیں گے۔ سکول کا باقاعدہ اختتام محنت کشوں کے عالمی ترانے انٹرنیشنل، فلک شگاف انقلابی نعروں اور فلسطین کے عوام کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا گیا۔

راولپنڈی: یوٹیلیٹی اسٹورز کارپوریشن کے محنت کشوں کی آٹھ روزہ کامیاب جدوجہد!

رپورٹ: عروہ خان

حکمران طبقات نجکاری، ڈاؤن سائزنگ، رائٹ سائزنگ، مراعات میں کٹوتیاں، جبری برطرفیاں، آؤٹ سورسنگ اور اداروں کی جزوی یا مکمل بندش جیسے مزدور دشمن اقدامات عالمی مالیاتی اداروں کے کہنے پر مختلف ادوار کے اندر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ جس کے ساتھ ہی ان وحشتوں کے تدارک کے لئے پبلک سیکٹر کے ملازمین بھی ان حملوں کے خلاف صف بندیاں کر کے حکمران طبقات کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کرتے رہے ہیں۔ موجودہ حکومت نے 40 اداروں کی جزوی یا مکمل بندش، آؤٹ سورسنگ اور نجکاری کا فیصلہ کیا ہے۔ جن میں یوٹیلیٹی اسٹورز کارپوریشن بھی شامل ہے۔ اس ادارے کی 50 ارب سے زائد کی املاک میں 200 سے زائد گاڑیاں، 4 ہزار اسٹور اور 1500 فرنچائزیں شامل ہیں جبکہ 2 ہزار مزدوروں اور 12 سے 14 ہزار ملازمین کا روزگار بھی اس سے وابستہ ہے۔ حکومتی اعلان کے بعد سید عارف حسین شاہ، رفیق قریشی اور راجہ مسکین نے آفیسرز ایسوسی ایشن کے ساتھ مل کر جوائنٹ ایکشن کمیٹی بنا کر 26 اگست بروز سوموار 2024ء کو بلیو ایریا ہیڈ آفس اسلام آباد کے باہر احتجاجی دھرنے کا اعلان کرتے ہوئے اس جدوجہد کا آغاز کیا۔ ہزاروں محنت کشوں نے آٹھ روزہ جدوجہد میں جس یگانگت، یکجہتی اور جوش و جذبے کا اظہار کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس سلسلے میں پی ٹی یو ڈی سی سمیت ٹریڈ یونینز کے قائدین اپنے وفود کے ساتھ کارپوریشن ملازمین کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لئے بھی آتے رہے۔ دلیرانہ قیادت اور ملازمین کے جوش و جذبہ نے حکومت کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور کارپوریشن کے ملازمین جیت گئے۔

راولپنڈی: ہزاروں مرد و خواتین اساتذہ کا نجکاری اور آؤٹ سورسنگ کیخلاف احتجاج

رپورٹ: پی ٹی یو ڈی سی راولپنڈی

24 ستمبر بروز منگل 2024ء کو پنجاب ٹیچرز یونین کے زیر اہتمام سکولوں کی نجکاری اور آؤٹ سورسنگ کے خلاف ہزاروں مرد و خواتین اساتذہ نے راولپنڈی پریس کلب کے باہر جمع ہو کر ممکنہ نجکاری اور آؤٹ سورسنگ کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا۔ احتجاجی اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے صدر قاضی عمران نے کہا کہ حکومت پنجاب کی علم دشمنی اور غریبوں سے سستی تعلیم کی سہولت ختم کرنے کی تمام تر کوششیں ناکام بنائیں گے۔

راولپنڈی: میونسپل کارپوریشن کے ملازمین کا احتجاجی مظاہرہ

رپورٹ: عروہ خان

مورخہ 26 ستمبر 2024ء کو مستقل ملازمت، پنشن اصلاحات، لیبر کوڈ 2024ء اور ٹھیکیداری نظام کے خلاف میونسپل لیبر یونین (سی بی اے) کے زیر اہتمام احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔ ریلی کی قیادت راجہ ہارون صدر میونسپل لیبر یونین میونسپل کارپوریشن، شاہد رضا پادری جنرل سیکرٹری، ملک اشفاق نائب صدر، جاوید خان، راجہ مجید سرپرست اعلیٰ میونسپل لیبر یونین اور نثار کیانی نے کی۔ آئی ایم ایف اور حکومت کی مزدور دشمن پالیسیوں کیخلاف احتجاجی ریلی میونسپل کارپوریشن راولپنڈی سے پریس کلب راولپنڈی تک نکالی گئی جس میں ہزاروں محنت کشوں نے شرکت کی۔ اس احتجاجی ریلی میں پاکستان ٹریڈ یونین ڈیفنس کمپئین (PTUDC)، ریوولوشنری سٹوڈنٹس فرنٹ (RSF)، ریلوے ورکرز یونین، ریلوے انقلابی یونین، پی ایم ڈی سی یونین اور پیپلز یونٹی پی آئی اے کے رہنماؤں نے بھی شرکت کی۔ احتجاجی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے مزدور رہنماؤں نے کہا کہ مزدوروں کے حقوق کی جنگ ہر میدان میں لڑی جائے گی اور یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ہمارے حقوق مل نہیں جاتے۔

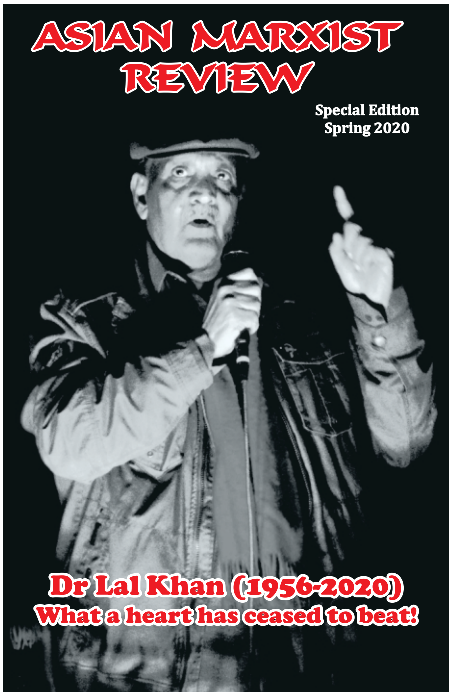
ASIAN MARXIST REVIEW
Special Edition
Spring 2020
Dr Lal Khan (1956-2020)
What a heart has ceased to beat!

ماهوار
دنيا جا پورهيتو هڪ ٿي وڃو!
مسلسل اشاعت جا 35 سال
طبقاتي
جدوجهد
انقلابي سوشلزم جو علمبردار!

مزدور مورچہ
मज़दूर मोर्चा
पाक्षिक

MAZDOOR NAMA
ایڈیٹر
قمرالزماں خاں
مزدور نامہ
قیمت
10 روپے
پاکستان ٹریڈ یونین ڈیفنس کمپئین کا ترجمان

سہ ماہی مجلّہ
عزم
جواں نسل کے انقلابی وسیاسی شعور کا ترجمان

SUMMER MARXIST SCHOOL
23-25 August 2024, Swat

سری لنکا: ڈسانائیکے کی آزمائش!
THEN
NOW
IMF

THE STRUGGLE

Workers of the world unite

Vanguard of Revolutionary Socialism!

انقلابی آئین ساز اسمبلی کا قیام

آئین میں سرمایہ دارانہ نظام اور ریاستی جبر و استحصال کو جواز فراہم کرنے والی تمام شقوں کا خاتمہ۔ محنت کشوں کے حقیقی نمائندوں پر مشتمل آئین ساز اسمبلی کا قیام جو منتخب عوامی پنچائیتوں کے جمہوری کنٹرول پر مبنی ایسے معاشرے کو تشکیل دے جس سے بنیادی حقوق کی فراہمی یقینی بن سکے۔

محنت کش

افراطِ زر کے ساتھ منسلک محنت کش کی تنخواہ کم از کم ایک تولہ سونے کے برابر۔ تمام بنیادی سہولتوں کی عوام کو مفت فراہمی۔ ہفتہ وار اوقاتِ کار کو 35 گھنٹے کرنا۔ ٹھیکیداری نظام اور چائلڈ لیبر کا خاتمہ۔

صنعت اور معیشت

تمام قومی اور سامراجی اثاثوں کو ضبط کر کے مزدوروں کے جمہوری کنٹرول اور انتظام میں دینا۔ نجکاری اور ڈاؤن سائزنگ کا مکمل خاتمہ۔ تمام سامراجی قرضوں اور اثاثوں کی ضبطگی۔ سامراجی جبر کے خلاف جدوجہد کو طبقاتی بنیادوں پر منظّم کرنا۔

غریب کسان

تمام جاگیروں کی مزارعوں میں تقسیم۔ اجتماعی کاشتکاری کا فروغ اور جدید ٹیکنیکی بنیادوں پر زرعی انقلاب

نوجوان

روزگار کی ضمانت یا 10,000 روپے بے روزگاری الاؤنس۔ طبقاتی نظام تعلیم کا خاتمہ اور تمام سطحوں پر مفت تعلیم۔ طلبہ یونین سازی پر عائد پابندی کا فی الفور خاتمہ۔ 16 سال کی عمر میں ووٹ کا حق۔

خواتین

تمام رجعتی قوانین کا خاتمہ۔ محنت کش خواتین کو تمام شعبوں میں مساوی حقوق اور نمائندگی۔ زچگی کے دوران تنخواہ سمیت 6 ماہ کی رخصت۔ گھریلو اور صنعتی محنت میں تفریق کا خاتمہ۔

مذہبی اقلیتیں

مذہبی اقلیتوں کو برابری کے حقوق۔ سماجی و ثقافتی تعصب اور جداگانہ طریق انتخاب کا خاتمہ۔ ریاست کو مذہب سے علیحدہ کرنا۔

قومی مسئلہ

مظلوم قوموں کے حق خود ارادیت کا تسلیم کیے جانا اور قومی آزادی کی تحریکوں کو طبقاتی جدوجہد سے منسلک کرتے ہوئے برصغیر کی رضاکارانہ سوشلسٹ فیڈریشن کا قیام جو تمام قومی و ثقافتی حقوق کی ضامن ہوگی۔

فوج

فوج میں کمیشن سسٹم کا خاتمہ۔ افسروں اور سپاہیوں کی تنخواہیں اور مراعات مساوی ہونا۔ تمام افسروں کا سپاہیوں کی کمیٹیوں کے ذریعے انتخاب۔ ایٹمی اور روایتی ہتھیاروں کا خاتمہ۔

خارجہ پالیسی

خارجہ پالیسی کی طبقاتی بنیادوں پر استواری۔ افغانستان سمیت دوسرے ممالک میں مداخلت اور رجعتی ملاؤں کی حمایت کا خاتمہ۔ سامراجی گماشتگی اور قومی شاونسٹ طرز کی خارجہ پالیسی کا مسترد کیے جانا۔ محنت کشوں کو بین الاقوامی تحریک سے منسلک کرتے ہوئے عالمی سوشلزم کی جدوجہد کو تیز کرنا۔